قبر میں زندہ آدمی

(افسانے)

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں و کشمیر)

ساقیِ اربابِ ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

قبر میں زندہ آدمی

(افسانے)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر)

©جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

Qabar mein Zindah Aadmi

(Short Stories)

by

DR. MUSHTAQ AHMED WANI
Assistant Professor Department of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University Rajouri (J&K)
Lane No. 3, House No.7, Firdousabad, Sunjwan Jammu 180011

نام کتاب : قبر میں زندہ آدمی
مصنف : ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سنہ اشاعت : 2019
قیمت : 200روپے
مطبع : میزان سروسز
ناشر : میزان پبلشرز

Meezan Publishers
Batmaloo Srinagar 190009 Kashmir
9419002212, 8494002212, 7006773403
E-mail:meezanpublishers@gmail.com

انتساب

عدل وانصاف کے علمبردار

محترم جناب شیخ شکیل احمد صاحب

سینئر وکیل جموں وکشمیر ہائی کورٹ جموں کے نام اور ان کے کارکن ساتھی

جناب شیخ نجیب اشرف

جناب عرفان محمد

جناب شیخ ذولفقار

جناب راہل رعنا

جناب سورج سنگھ

اور

عزیزم طارق کے نام جو مقدمات کی فائلیں سنبھالنا جانتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

دبستان ہمالہ

ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی
راجوری، جموں وکشمیر

Himalayan Education Mission Society
Rajouri, Jammu - 185131 (J&K)
Contact Nos: 9419170902, 9419184689, 9419170905
E-mail:himalayan517@gmail.com

فکشن مزاج ناقدین کی ادبی کہکشاں

ترتیب

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
1	قبر میں زندہ آدمی (ایک تجزیاتی مطالعہ)	پروفیسر قدوس جاوید	7
2	مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں کائنات کی گویائی	مناظر عاشق ہرگانوی	15
3	مشتاق احمد وانی	پروفیسر بیگ احساس	29
4	مشتاق احمد وانی کی افسانوی کائنات	پروفیسر شہزاد انجم	31
5	مشتاق احمد وانی کا تخلیقی شہکار ''قبر میں زندہ آدمی''	پروفیسر شریف احمد قریشی	33
6	افسانوی مجموعہ ''قبر میں زندہ آدمی'' کا فنی تجزیہ	ڈاکٹر حمید اللہ خان	50
7	حقیقت کو کہانی بنانے کا فن کوئی مشتاق احمد وانی سے سیکھے	احمد رشید	61
8	مشرقی روایت کا امین: مشتاق احمد وانی	محمد مستمر	70
9	مشتاق احمد وانی کا افسانوی مزاج	محمد غالب نشتر	81

افسانے

نمبر شمار	نام افسانہ	صفحہ
1	مجھے ایک دن گھر جانا ہے	87
2	انتظار مرگ	96
3	واپسی	99
4	حاضر جواب	105
5	انتقام	108
6	عورت	112
7	سب کی ماں	117
8	ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی	124
9	معاوضہ	132
10	کار خیر	138
11	چار چہرے	146
12	سات نمبر کا پاپوش	150
13	قبر میں زندہ آدمی	153

☆☆☆

پروفیسر قدوس جاوید
سابق صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی

قبر میں زندہ آدمی

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

مشتاق احمد وانی، اکیسویں صدی کے ڈسکورسیز کو افسانہ کے قالب میں ڈھالنے والا افسانہ نگار ہے، لیکن مشتاق وانی کا فنی امتیاز یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پہ افسانہ لکھتے ہوئے متعلقہ حقائق و مسائل کی تہوں اور طرفوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں اور پھر ان سے متعلق اپنے مطمحِ نظر کو تمام تر فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ افسانہ کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اخیر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو کے جن افسانہ نگاروں کو اردو کی پُرانی اور نئی بستیوں میں، یکساں طور پر اعتبار و احترام حاصل ہوا ان میں ڈاکٹر مشتاق وانی کا قد سب سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے اسباب کئی ہیں۔ اول یہ کہ مشتاق وانی اپنے ماحول اور معاشرہ کے بیچ زندگی جینے والا انسان ہے اور اس زندگی جینے کے عمل کے دوران جو تجربات و مشاہدات، مشاق وانی کے جذبہ و احساس کے آنگن میں اترتے ہیں انھیں وہ اپنی تخلیقی قوت تخیل و تصور کی پرواز اور زبان و بیان کی مہارت کی مدد سے بیانیہ (Narration) کی وہ شکل عطا کرتے ہیں جسے افسانہ کہتے ہیں۔ مشتاق وانی آج کے افسانہ نگار ہیں لیکن انھیں اردو افسانہ کی روایات واقدار عزیز ہیں۔ اس کے ساتھ

ہی وہ اردو فکشن پر مغربی فکشن کے موضوعاتی، اسلوبیاتی اور اظہاری بیانیاتی اجتہادات کے اثرات کی بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی تصنیفات ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' آئینہ در آئینہ' اعتبار و معیار'' شعور بصیرت'' اور'' اردو ادب میں تانیثیت'' اور'' افہام وتفہیم زبان و ادب'' وغیرہ کے علاوہ ان کے تازہ ترین متفرق مضامین سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مشتاق وانی کے افسانوی مجموعوں ''ہزاروں غم'' ''میٹھا زہر'' اور'' اندر کی باتیں'' میں شامل افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جموں کشمیر کے نئے معتبر معاصر افسانہ نگاروں، مشتاق مہدی، ریاض توحیدی، ناصر ضمیر، راجہ یوسف، طارق شبنم وغیرہ کے ساتھ ساتھ مشتاق وانی بھی اردو افسانہ کے سرمایہ میں قابل قدر اضافے کر رہے ہیں، لیکن مشتاق وانی کے افسانے موضوع اور بیانیہ کے حوالے سے اپنے معاصرین سے قدر مختلف ہوتے ہیں مشتاق وانی کا ایک اہم شناختی امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں میں فنی و فکری ہر جہت سے تازہ کاری تو ہوتی ہے، لیکن مشتاق وانی نام نہاد جدید افسانہ نگاروں کی طرح اپنی مسلمہ مذہبی، سماجی اور ثقافتی قدروں کی نفی نہیں کرتے اور نہ ہی بعض مابعد جدید افسانہ نگاروں کی طرح غیر ضروری طور پر جنسی اور نظریاتی آزادی کی حمایت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مشتاق وانی کے افسانوں کی قرات کا دائرہ ہر حلقہ میں وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ مشتاق وانی کے اب تک تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'قبر میں زندہ آدمی' ڈاکٹر مشتاق وانی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ مجموعہ میں شامل ۱۳ افسانوں کے عنوانات سے بھی مشتاق وانی کی سوچ اور فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

(۱) مجھے ایک دن گھر جانا ہے (۲) انتظار مرگ (۳) چار چہرے (۴) حاضر جواب (۵) ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی (۶) کار خیر (۷) انتقام (۸) معاوضہ (۹) عورت (۱۰) سب کی ماں (۱۱) واپسی (۱۲) سات نمبر کا پاپوش۔ (۱۳) قبر میں زندہ آدمی۔

ان افسانوں کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تخلیق کا زمانہ حالیہ چند برسوں پر ہی محیط ہے۔ عالمیت (Globlisation) اور بازاریت کے سبب ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں صارفینی سماج اور تہذیب (Consumeristic Culture & Society) کے خط وخال تو بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہی نمایاں ہو چکے تھے، لیکن اکیسویں صدی میں مادہ پرستی کچھ زیادہ ہی مضبوط اور مستحکم ہوئی۔ روزمرہ کے معاملات کو بھی گناہ اور ثواب کے بجائے نفع اور نقصان کی بنیاد پر برتا جانے لگا، لیکن اس کے بھیانک نتائج، بدعنوانی، بد اعمالی، فرقہ پرستی، دہشت گردی، جنسی جرائم اور فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں سامنے آنے لگے۔ خاص طور پر فرقہ پرست افراد کی جانب سے 'گھر واپسی' لو جہاد، گائے اور اذان کے نام جو تشدد کے واقعات ہوئے اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس پہ مستزاد یہ کہ ۲۰۱۴ء میں 'ہندوتو' اور تہذیبی قومیت' کی حامی قوتوں کے برسراقتدار آنے کے بعد مسلم اقلیت کچھ خوف اور کچھ تشویش میں بھی مبتلا ہوئی۔ اس کا ایک ردعمل تو یہ ہوا کہ مسلمانوں نے فراست مومن کا ثبوت دیتے ہوئے صبر وتحمل سے کام لیا۔ دوئم یہ کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنی اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا بہتر جانا۔ یوں بھی ادھر کچھ عرصہ سے ریاست اور ملک کے مسلم معاشرے میں بھی مذہبی اور اخلاقی قدروں میں جو تشویش ناک انتشار اور زوال آیا، اغیار اس کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ معاصر اردو فکشن میں ایک طرف جہاں تہذیبی تکثیرت (Cultural Pluralism) جنسی جرائم (Sexual Offence) معاشی بحران اور ذلت غم وغصہ وغیرہ 'بیانیہ' کا حصہ بن رہے ہیں، وہیں ہلکے سروں میں ہی سہی مذہبی واخلاقی بیانیہ بھی اردو کے چند ایک فکشن نگاروں کے یہاں نمایاں ہوا ہے۔ مشتاق وانی کا نام ان میں سرفہرست ہے۔ مشتاق وانی کے اس اختصاص کا اندازہ ان کے افسانوی مجموعہ ''قبر میں زندہ آدمی'' میں شامل افسانوں کے درج ذیل اقتباسات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''اپنے مکان کی چوتھی منزل پر جونہی محسن میاں نے قدم رکھا تو انھیں یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے مکان سے پورے شہر پر نظریں دوڑا سکتے ہیں۔ وہ ایکسائز انسپکٹر تھے، لیکن ان کے دل ودماغ میں یہ بات رچ بس چکی تھی کہ حرام کی کمائی میں آدمی کو سکون نہیں ملتا۔ جائز وناجائز کا سبق انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں پڑھا تھا جو انھیں اچھی طرح یاد رہ گیا تھا۔ حسن اخلاق سے ہر کسی کا دل جیتنے میں خاصے ماہر ہو گئے تھے''۔

(افسانہ ''قبر میں زندہ آدمی'')

لیکن آج کے دور میں حق وصداقت اور دیانتداری کے ساتھ جینا، مرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس حقیقت کو مشتاق وانی نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنے افسانہ ''ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی'' میں یوں پیش کیا ہے:

''لعل محمد، محکمہ باغبانی میں تیسرے درجے کے ملازم تھے۔ دس سال سروس ابھی باقی تھی۔ آدمی شریف، دیانتدار، حق پرست، محنتی، ذہین اور بہترین حسن اخلاق وکردار کا مالک ہو تو جدید معاشرے کے منافق، حاسد، عیار، مکار اور رنگے سیار قسم کے لوگ اسے برداشت نہیں کرتے اور ایسی جملہ صفات کا حامل آدمی اکثر پریشان بھی رہتا ہے''

لعل محمد اپنی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ہی جی پی فنڈ سے تین لاکھ روپے نکالنے کی درخواست دیتا ہے، لیکن دفتر کے کلرک اسے پریشان کرتے ہیں۔ ہیڈ کلرک رشوت کے طور پر دس ہزار روپے اور وہسکی کی بوتل کا مطالبہ کرتا ہے:

''دس......ہزار......روپے......اور وہسکی کی بوتل؟

لعل محمد کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کا سارا وجود مفلوج ہو گیا ہو۔ وہ آہستہ سے اٹھے اور گھر چلے آئے۔''

اگر دیکھا جائے تو تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی پاسداری کے اعتبار سے مشتاق وانی کے افسانوں کا رشتہ راشد الخیری کے ''نصیر اور خدیجہ'' کثرت ازدواج'' اور سلطان

حیدر جوش کے ''نابینا بیوی'' اور اتفاقاتِ زمانہ'' جیسے افسانوں سے قائم ہوتا ہے۔

مشتاق وانی کے اکثر و بیشتر افسانوں میں ان کی ذاتی نارسائیوں اور محرومیوں کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔ مشتاق وانی نے قدرتی مناظر سے بھرپور بلند و بالا پہاڑیوں کے دامن میں، بل کھاتی ندیوں اور گنگناتے چشموں کے کنارے آباد گاووں میں آنکھیں کھولیں، بچپن گزارا، ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہروں کے شب و روز بھی دیکھے۔ اردو میں ایم اے، بی ایڈ، پی ایچ ڈی، نیٹ اور ڈی لٹ کیا۔ مطالعہ وسیع تھا اور ذہن ذرخیز، کم عمری سے ہی افسانے اور تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے لگے تھے۔ ادب کے حوالے سے کام بھی تھا اور نام بھی، لیکن اس کے باوجود تنگ نظر پروفیسروں نے مشتاق وانی کو کسی کالج یا یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر نہیں دیا۔ جب کہ ایسے ایسے نااہلوں کو پروفیسر بنایا گیا جو صلاحیت کے حوالے سے مشتاق وانی کے پاوں کی دھول کے برابر بھی نہ تھے۔ دراصل کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسری کے لیے صلاحیت کی بجائے کچھ اور باتوں کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ نااہل اور اخلاق سے کمزور اساتذہ نہیں چاہتے کہ با صلاحیت اور باکردار افراد شعبے میں آئیں، اس سے ان کی کور دبنے کا خدشہ رہتا ہے۔ مشتاق وانی کو بھی اسی لیے ایک عرصے تک کسی یونیورسٹی میں داخل ہونے نہیں دیا گیا۔ اب کہیں کافی تاخیر سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں و کشمیر) میں اردو شعبے سے وابستہ ہوئے ہیں۔ پروفیسر مشتاق وانی نے اپنے اس کرب کا اظہار اپنے افسانہ ''معاوضہ'' میں بڑے ہی پُر تاثیر انداز میں کیا ہے:

''پروفیسر دھرم چند کہنے لگے مجھے بہت دکھ ہے کہ تُو اردو کا پروفیسر نہیں بن پایا۔ حیرت تو یہ ہے کہ دو یونیورسٹیاں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ کروا چکی ہیں اور تین یونیورسٹیوں میں تجھ پر ڈاکٹریٹ کا کام ہو رہا ہے...... آخر چکر کیا ہے؟'' ''دھرم چند...... یار...... میرے پاس توحید و رسالت کی عظمت و فضیلت، پانچ وقت کی نمازوں کی ٹھنڈک، رمضان المبارک کے تیس کا

تقویٰ، عشر و ذا کواۃ کی اہمیت و افادیت اور حج و عمرہ کی تمنا تھی۔ چنانچہ دو متضاد طبیعتوں کے تصادم کے سبب مجھ سے میرا حق چھینا گیا۔" (افسانہ "معاوضہ")

مشتاق وانی کے اس تازہ ترین مجموعہ میں افسانہ "قبر میں زندہ آدمی" میں بھی جس پر اس مجموعے کا نام رکھا گیا ہے۔ مشتاق وانی نے مذہبی بیانیہ کو ہی برتا ہے۔ عام انسانی فطرت ہے کہ جب اس کے پاس دولت آجاتی ہے تو وہ دین سے دور ہو جاتا ہے، لیکن جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے۔ مشتاق وانی نے اسی حقیقت کو اپنے اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ مذکورہ افسانے کے مرکزی کردار 'یار خاں' کو قارئین سے اس طرح متعارف کرواتے ہیں:

"یار خاں، قومی شاہراہ پر ٹنل تعمیر کرنے والی ایک آسٹریلین کمپنی کے ساتھ اے کلاس ٹھکیدار تھے۔ روپے پیسے کو وہ اپنے ہاتھ کی میل سمجھتے تھے۔ شہر میں ان کا بہت بڑا مکان دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی منسٹر کی کوٹھی ہے۔ اس قدر رنگین مزاج تھے کہ دنیا کو دارالعمل کے بجائے دارالتفریح سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ام الخبائث کو صحت کے لیے مفید خیال کرتے تھے۔" (افسانہ "قبر میں زندہ آدمی)

لیکن ایک بار جب یار خاں قبر نما غسل خانے میں گویا زندہ دفن ہو گئے اور موت سامنے آکھڑی ہوئی تو توبہ استغفار کے بعد اپنی اہلیہ کی مدد سے اس قبر سے زندہ نکل تو آئے، لیکن تب تک ان کی سوچ اور فکر کی دنیا بدل چکی تھی۔ موت اور حیات کی قدر و قیمت ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ غسل خانے کی قبر سے باہر نکل کر یار خاں پہلے تو بیوی، بھائی اور بچوں سے گلے ملے اور رقت آمیز لہجے میں لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

"میں جیتے جی قبر میں پہنچ گیا تھا۔ اوپر والے کی مہر کہ زندہ ہوں۔ دنیا والو! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کب اوپر والے کا بلاوہ آجائے، اس لیے سنبھل جاو، اچھے بُرے کا خیال رکھو" (افسانہ "قبر میں زندہ آدمی")

لیکن ایسا نہیں ہے کہ مشتاق وانی نے اپنے افسانوں میں صرف اور محض دینی اور اخلاقی قدروں کو ہی برتا ہے۔ دینی اور اخلاقی تقاضوں کے ساتھ ساتھ مشتاق وانی نے عصر حاضر کے سنگین مسائل اور حقائق کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً طبقہ نسواں کو درپیش چیلنجوں پر ان کا افسانہ ''عورت'' 'تانیثی ڈسکورس' کو ایک نئی جہت دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور باشعور رام دُلاری کا اپنے باس سے یہ کہنا کہ:

''سر...... میں آپ کو یہ یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ہمارے ملک میں عورتوں پر ظلم وستم، ان کی خودکشی اور اغوا کی بنیادی وجہ ان کی بے پردگی ہے۔ اگر ہمارے ملک کی تمام عورتیں، بلالحاظ مذہب وملّت پردے کو بطور تحفظ عزت وعصمت اپنائیں تو عورتوں سے جڑے ان تمام ظلم وزیادتیوں اور جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے'' (افسانہ ''عورت'')

اب لوگ مشتاق وانی کے اس نظریے کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کٹھوعہ (جموں) میں آٹھ سالہ معصوم بچّی کی اجتماعی آبروریزی اور قتل کے بعد اکثر لڑکیاں پردے میں نکلنے لگی ہیں۔ اسی طرح افسانہ ''واپسی'' اردو میں دلت کہانی کی عمدہ مثال ہے۔ آج بھی بعض گاوں اور قصبوں میں پانی کا کنواں ہی نہیں دلتوں کو 'شمشان گھاٹ' بھی الگ تھلگ بنانا پڑتا ہے، لیکن مشتاق وانی نے اس افسانہ میں ہندو معاشرہ کی طرح مسلم معاشرہ میں بھی رائج مسلکی تفرقہ پر بجا طور پر طنز کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر مسلمان بھی فرقوں میں نہ بٹے ہوتے تو اس افسانہ ''واپسی'' کے مرکزی کردار دیارام جیسے لاکھوں غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہوتے۔

دورِ جدید کی ایک روش یہ بھی سامنے آئی ہے کہ نوجوان شادی شدہ بیٹے اور بہو اب والدین کو بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ مشتاق وانی نے اس موضوع کو افسانہ ''انتظار مرگ'' میں نہایت فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

افسانہ ''سب کی ماں'' مشترکہ تہذیب وکلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ بوڑھی بہاراں

کے کردار کو جس فنی چابکدستی سے مشتاق وانی نے پیش کیا ہے۔ وہ ان کے بالیدہ تخلیقی شعور کی عمدہ مثال ہے۔ بہاراں کی موت پر ہندو، مسلمان اور سکھ فرقوں کا اظہار تاسف قومی اتحاد کی ضرورت کو آشکار کرتا ہے۔

غرضیکہ ڈاکٹر مشتاق وانی عصر حاضر کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا فن کسی بھی طرح کی فیشن پرستی سے آلودہ نہیں۔ مشتاق وانی جس ایمانداری کے ساتھ زمین پر جیتے ہیں ویسی ہی دیانتداری ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مشتاق وانی کو افسانہ میں استعارات اور علامتی اسلوب اختیار کرنے سے پرہیز نہیں لیکن وہ 'پر مجھے گفتگو عوام سے ہے' کے قائل ہیں۔ اسی لیے روزمرہ کی زندگی میں اپنے آس پاس زندگی جینے والے عام کرداروں اور ان سے وابستہ واقعات کو سیدھے سُبھاؤ اپنے افسانوں میں پیش کرنے کا انداز قاری کو اپنی گرفت سے باہر نہیں جانے دیتا۔ مشتاق کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کوئی بھی قاری ایک بار ان کے کسی افسانے کی قرأت شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی بات قاری کے دل میں کچھ محسوس اور کچھ نامحسوس طور پر اس طرح اتر جاتی ہے کہ مشتاق وانی کا افسانہ، محض افسانہ نہیں رہتا زندگی جینے کا ایک مہذب اور محترم سلیقہ بن جاتا ہے اور یہ مشتاق وانی کے فن افسانہ نگاری کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔

....

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگلپور(بہار)09430966156

مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں کائنات کی گویائی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اردو کے حقیقت پسند اور بے باک افسانہ نگار ہیں۔ ایجاز واختصار اور فنی حسن کی چاشنی ان کے افسانوں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ وہ حقائق اور واقعات کو ہو بہو پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ہر وہ بات جو ان کے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہے اور زندگی کے کسی رخ کو سامنے لاتی ہے اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور محسوسات کو افسانہ کا روپ دے دیتے ہیں۔ ان کا فن زندگی کے میلانات کا عکس ہے جس میں جذبات، نفسیات، ضرورت اور تقاضے سبھی کچھ وسیلہ بنتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی جس شہر اور گاوں میں رہتے ہیں، کشمیر کے جس ماحول میں سانس لیتے ہیں اور اپنے عہد کی نزاکتوں کو جس طرح دیکھتے ہیں ان سے متاثر ہونا فطری ہے۔ تلخ حقیقتوں کی ترجمانی میں ہی ان کا آرٹ پوشیدہ ہے۔ آرٹ کا مقصد سماج کی حقیقی ترجمانی کرنا، زندگی کی سچائیوں کو تجربات کے ساتھ پیش کرنا اور بے اعتدالیوں کی بھی نقاب کشائی کرنا ہے۔

مشتاق احمد وانی واقعات کی افادیت اور حیثیت کے پارکھی ہیں۔ زندگی کے تقاضے، نئی قدریں، سیاسی سازشیں، اقلیتوں کی پامالی، آپسی رنجشیں اور مختلف الجہاتی حقیقتوں کا ادراک اور ان سے قربت کی حد تک مشاہدہ، پھر برتنے کا سلیقہ ان کی فنی تخلیقیت شناسی کی مظہر ہیں۔ افسانہ ''دوہری مار'' کے کرداروں کے افعال داخلی کشمکش اور ذہنی کیفیات کی

شکست وریخت کواجاگر کرتے ہیں۔ فیضان اوراس کے گھر والوں کا دہشت گردوں سے سامنا، اس کے گھر میں پناہ لینا، روپے کا مطالبہ کرنااور پھر متور جیسے غنڈے کی وجہ سے فوجیوں اور پولیس کی اذیت رسانی۔۔۔!رونگٹے کھڑے کردینے والی کشمیر کی اس سچائی سے وہی آشنا ہو سکتے ہیں جو وہاں کے اندرونی حالات سے واقف ہیں اور مشتاق احمد وانی جیسے فنکاراس دردکو سمجھتے ہیں:

''ان کی وضع قطع سے ہی دہشت جھلک رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھیاں مگر سر کے بال شانوں تک بڑھے ہوئے، سیاہ پٹھانی لباس میں ملبوس، اوپر سے سیاہ چمڑے کی جیکٹیں پہنے۔ گویا اس بات کا علامیہ پیش کررہے ہوں کہ انسان کی سیاہ کاریاں تمام حدود کو پہنچ چکی ہیں اوران کا قلع قمع کرنے کے لیے اسی طرح کی وضع قطع کے آدمی درکار ہیں۔ وہ بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ دبے پاوں قدم بڑھاتے ہوئے فیضان کے گھر پہنچ گئے۔رات کے دس بج چکے تھے''

مسافر بتا کراندرداخل ہونے والے یہ دہشت گرد بندوقوں سے لیس تھے:

''کوئی بھی باہر جانے کی کوشش نہ کرے۔ ہمارے لیے کھانا تیار کرو۔ بھوک نے ہمیں نڈھال کردیا ہے۔ ہمارے دوآدمی باہر کھڑے ہیں''

سرپرست نے کسی حد تک دھمکی آمیز روّیہ اختیار کیا۔ فیضان کی ماں، اس کی بیوی اور بہن تینوں کھانا پکانے میں لگ گئیں''

سرپرست فیضان سے سوالات کرتا ہے، پھر کہتا ہے:

''ہمارے ساتھ چلو گے؟''

''بھائی صاحب !......نہیں چل سکتا......چھوٹے چھوٹے بچّوں کو......چھوڑ کر کہاں جاوں''

فیضان کی آنکھوں میں آنسوامڈآئے اوراس کے باپ نے سرپرست کے آگے

ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا

''بیٹا!...... میرا یہ ایک ہی لعل ہے...... اس کو ساتھ نہ لے جانا، میرا دم نکل جائے گا''

''ہمارے ساتھ چلو یا پھر پچاس ہزار روپیہ دو۔ ہم تمہاری آزادی کے لیے دن رات لڑ رہے ہیں اور تمہیں بیوی بچے پیارے ہیں''

بہت منت ساجت کے بعد تیس ہزار روپے چار دن کے اندر دینے کا حکم نامہ جاری کر کے وہ چلے گئے، لیکن چوتھے دن اے کے سنتالیس کے ساتھ آدھمکے اور تیس ہزار روپے لے کر ہی گئے! اس تیس ہزار روپے کے لیے فیضان اور اس کے گھر والوں کو زیور اور وہ اثاثہ بھی بیچنا پڑا جو چھوٹی کے بیاہ کے لیے تھا۔ نخری کی شادی ہوئی تھی، جس پر پڑوس کے غنڈہ منور کی نظر تھی۔ اس کی بے جا حرکتوں سے تنگ آ کر ہاتھ میں ہتھیار لے کر فیضان اس کے گھر جا پہنچا۔ پڑوسیوں نے بیچ بچاؤ تو کر دیا۔ لیکن منور انتقام کی سوچنے لگا:

''ایک دن منور فوج کے کمانڈر کے پاس چلا گیا اور اس سے فیضان کی شکایت کی کہ وہ دہشت گردوں کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے اور ان کی مالی معاونت کرتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ کمانڈر اپنے چالیس سپاہیوں کو ساتھ لے کر فیضان کے گھر پہنچ گیا۔ کچھ سپاہیوں نے مکان کو چاروں طرف سے اپنی مخصوص فوجی پوزیشن میں گھیر لیا اور کچھ اپنے کمانڈر کے ہمراہ فیضان کے گھر میں داخل ہوئے۔ شکاری کتا ان کے ساتھ تھا''

گھر کی تلاشی میں کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی۔ جس کا تعلق تخریبی کاروائی سے ہوتا۔ تب کمانڈر نے فیضان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا ''اسے گاڑی میں بٹھاؤ''

آگے کی تفصیل مشتاق احمد وانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''فوجی کیمپ میں رات بھر اسے زدوکوب کرتے رہے۔ دوسرے دن انھوں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے دس دن کے لیے اذیت خانے میں بھیج دیا جہاں

اذیت رساں افراد نے اسے اذیت دینے میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑی۔اس کے ناخن پلاس سے اکھاڑ دیے گئے اور بجلی کے شاک دے دے کر اسے ایک طرح سے مفلوج بنا دیا۔دس دن کے بعد جب فیضان اپنے گھر لوٹا تو اس کے ماں باپ اسے پہچان نہیں پائے‘‘

فیضان کو اذیت دے کر گھر واپس کردینے کا یہ ایک رُخ ہے۔اس اذیت سے اس کی آگے کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔جس کا انکشاف مشتاق احمد وانی نے اس طرح کیا ہے:

’’دو ماہ کے بعد فیضان کے سر میں درد کی ترنگ سی ابھرنا شروع ہوگئی جو بتدریج بڑھتی ہی چلی گئی۔ڈاکٹروں نے جب اس سے متعلق اپنے طبعی طریقہ تشخیص کی رپورٹ دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس کے دماغ میں ایک ایسا پھوڑا تیار ہورہا ہے جس سے اس کی قوت گویائی سلب ہوجائے گی اور پھر دھیرے دھیرے اس کے تمام حواس خمسہ کام کرنا چھوڑ دیں گے‘‘

یہ کہانی صرف فیضان کی نہیں ہے بلکہ کشمیر کے بیشتر گھروں کے ان بے قصوروں کی ہے، جنھیں ذبردستی ملٹری اور پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے اور اذیت دیتی ہے۔مشتاق احمد وانی کا یہ سچا افسانہ خون سے تر بتر ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔کشمیر کے دلدوز حالات کے پس منظر کی ایک اور کہانی ’’جنم بھومی کے آنسو‘‘ ہے۔مشتاق احمد وانی نے ایک وطن پرست کی کہانی بیان کی ہے جو برات کے ساتھ سولہ سال کے بعد اپنی جنم بھومی جاتا ہے۔وطن کی محبت وعظمت کا احساس اور ناخوشگوار حالات کی یاد سے وہ بےچین ہوجاتا ہے۔منظر کشی دیکھیے:

’’اب وہ اپنے آبائی وطن کے ضلع صدر مقام سے گزر کر فلک بوس پہاڑوں، جنگلوں، ندی نالوں سے گزر رہا تھا۔کچی سڑک ہونے کی وجہ سے ڈرائیور نے کار کی رفتار دھیمی کردی۔کار کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ آج سے سولہ برس پیچھے اپنے وطن کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ جب اس کے وطن میں سڑک، بجلی، پانی، اسپتال، راشن ڈپو اور ٹیلی فون کی کوئی سہولت نہ تھی کیونکہ سیاسی لیڈر الیکشن

کے دوران آتے اور جھوٹے وعدے کر کے چلے جاتے اور عوام آپس میں معمولی معمولی باتوں پر جھگڑتے، مقدمہ بازی میں اپنا روپیہ اور وقت صرف کرتے۔ اس کے علاوہ چور، لچے لفنگے، جھوٹے، اوباش، دغا باز اور جادو ٹونا کرنے والوں کی کثیر تعداد تھی۔ پورے علاقے میں بجلی، پانی، سڑک، پانی کا معقول انتظام، راشن ڈپو، اسپتال اور ہائر اسکینڈری اسکول نہیں تھا''

یہ سولہ سال قبل کے حالات تھے۔ آج حالات کچھ بہتر ہیں تو دوسری مصیبت کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کے شب و روز خوف و ہراس میں گزر رہے ہیں، نادر چچا بتا رہے ہیں:

''کیا بتاوں بیٹے! تم تو یہاں کے حالات دیکھ ہی رہے ہو۔ نو سال سے تمہاری جنم بھومی جیسے آگ میں سلگ رہی ہے۔ اب تو ہمارے دن کا چین اور رات کی نیند ہم سے چھن گئی ہے۔۔۔ ان نو برسوں میں بیٹے تمہاری جنم بھومی پہ کئی بم پھٹے۔ کئی نو جوان مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ کتنی ہی بیویوں کے سہاگ اجڑ گئے اور کتنے ہی ذبح کیے گئے۔ میرا بیٹا اختیار احمد بھی تو گولی کا نشانہ بنا'' یہ کہتے ہوئے نادر چچا ایک بار پھر رو پڑے''

نادر چچا مزید روشنی ڈالتے ہیں:

''بیٹے ہم جن حالات سے جوجھ رہے ہیں وہ بڑے مایوس کن ہیں۔ آدھی آدھی رات کو فوجی ہمارے گھروں میں داخل ہوتے ہیں، تلاشی لیتے ہیں، انھیں دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے ڈر و خوف سے چلاّنے لگتے ہیں اور مرد و عورتیں ڈر کے مارے فوجیوں سے بات کرتے تھتھلا جاتے ہین تو فوجی ان کی پٹائی کرتے ہیں۔ اب تو بیٹے ان حالات میں مجھے بہو بیٹیوں کی عصمت بھی خطرے میں دکھائی دیتی ہے۔ کیا کریں؟ کہاں جائیں!''

برات کے لوٹنے کا منظر بھی بے چین کر دینے والا ہے۔ مشتاق احمد وانی سچ کو اس طرح منکشف کرتے ہیں:

''دلہن کو ڈولی میں نہیں بٹھایا گیا بلکہ بس اڈے تک پیدل لایا گیا کیونکہ فوجیوں کو ہر چیز کا شک رہتا ہے۔ ان کی مشکوک نگاہیں ہر چیز میں اسلحہ ڈھونڈتی ہیں۔ اس لیے کہ انھیں کسی بھی شخص پر یقین نہیں رہا ہے۔ ان کی نظر میں شادی اور غمی میں کوئی امتیاز نہیں ہے''

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کے موضوعات عام زندگی سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ الگ الگ مسائل پر ان کے افسانوں کے کردار زندگی کے مختلف باب اور پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ ترجمانی گویا شعلۂ مستعجل کے طور پر ہوتی ہے۔ اس کے اندر اتنی گہری اور پُر کشش معنویت ہوتی ہے کہ قاری حیات افروز بصیرت حاصل کرتا ہے۔ بشری مزاج اور نفسی کیفیات پر بھی وانی کی نظر ہوتی ہے:

''بس ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کر سکی تھی کہ راجندر کو تڑ تڑ کی آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک پچیس سالہ لڑکی ایک پولیس والے کو گریباں سے پکڑ کر اس کے سر پر چپل سے زور زور سے شاباشی دیتے ہوئے کہہ رہی تھی

''کیا تیری ماں بہن نہیں ہے؟ تو نے کیا مجھے ویشیا سمجھا ہے جو تُو اس طرح کی حرکت کر رہا ہے؟ آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی''

لڑکی کا چہرہ اور اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئی تھیں اور اس نے پوری گرفت سے پولیس والے کو گریبان سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا

''تم کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ تم تو میری بہن کی طرح ہو''

''اب میں تجھے بہن نظر آنے لگی'' لڑکی نے بڑی تلخی سے جواب دیا''

(افسانہ ''کوفت'')

سماج میں آئے دن ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ محافظ شیطان بن جاتا ہے۔ اس سے بھی ہم لاعلم نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں صنف نازک میں جرات کی کمی ہے۔ حیا و شرم مانع رہتی ہے اور جھجک تو ان کی فطرت میں شامل ہے۔ مشتاق احمد وانی نے

جرات مندانہ کردار سے بدلا و چاہا ہے۔ حالانکہ ایک کردار ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت کا اصل روپ یہی ہے:

''ہاں ہاں سچ کہتی ہوں، جتنا درد ماں کو اپنے بچے کا ہوتا ہے اتنا بچے کے باپ کو نہیں ہوتا۔ ہم بچوں کی مائیں آدھی آدھی راتوں کو جاگتی ہیں، بچوں کو دودھ پلاتی ہیں، بچہ بستر گیلا کردے تو اٹھا کر اپنی جگہ پہ سلاتی ہیں اور خود اس کی جگہ پر سو جاتی ہیں، لیکن مرد یہ سب کچھ تو نہیں کرتے۔ وہ آرم کی نیند سوتے ہیں، خراٹے لیتے ہیں۔ عورت نے جنم جنم سے اس دھرتی پر دکھ سہے ہیں مگر اف تک نہیں کی ہے'' (افسانہ ''درد بھری راتیں'')

کھوئی ہوئی جوانی واپس نہیں لوٹتی۔ عمر کی زیادتی سے جنسی قوت میں کمی آجاتی ہے۔ علاج معالجے سے بھی کچھ نہیں ہوتا کہ فطرت کا نظام ہی یہی ہے۔ مشتاق احمد وانی نے ایک کردار کی ایسی ہی دشا کو دکھلانے کی کوشش کی ہے:

''ماسٹر سوہن لعل نے اپنے اسکول کے چپراسی کو دو ماہ کی ڈیوٹی دے کر اپنے سالے پھول چند کی مالش اور طاقتور غذا کھلانے پر مامور کر دیا۔ للتا اپنے بھائی کو پھر سے جوان دیکھنے کی لاحاصل خوشی میں بازار سے انڈے، مچھلی، گوشت، سلاجیت، بادام، گری، چھوہارے اور دیسی گھی خرید لائی۔ اب ہر روز پھول چند کی مالش ہونے لگی اور بڑے اہتمام کے ساتھ اسے تمام طاقتور چیزیں کھلائی جانے لگیں۔۔۔ ڈیڑھ ماہ گزر جانے کے بعد بھی پھول چند کی جسمانی حالت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ بال سفید کے سفید ہی رہے۔ پشت کے جھکاو میں معمولی سا فرق بھی نہیں آیا۔ تیز چلنے سے سانس پھولتی تھی اس میں ذرہ بھر کمی نہ آئی۔ غرضیکہ ماسٹر سوہن لعل اور للتا کی ساری محنت رائیگاں جا رہی تھی''

(افسانہ ''مجبوری'')

عظمت و برتری، توانائی و دلکشی اور چسپاں لیبل سے SURVIVE کرنے اور حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ایک ماں کے اپدیش کو اس طرح بالادستی عطا کی گئی ہے

کہ قدر و منزلت سے زیادہ زندہ ذی روح کی پیائش و فہمائش نظر آتی ہے:

''بیٹی !ایسی باتیں نہ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ بھگوان نے چاہا تو سکھی رہے گی۔ بوڑھا ہے تو کیا ہوا۔ برہمن کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ یہ پوجنے کے لائق ہوتا ہے۔ اس کی رگ رگ میں شودھتا اور پوترتا ہوتی ہے۔ بھگوان نے تجھے بہت روپ سروپ دیا ہے اگر تُو اسے ایک بوڑھے برہمن کو ارپن کرے گی تو تجھے سبھی دکھوں اور غموں سے مکتی پراپت ہوگی۔ تُو بھاگیہ شالی ہے بیٹی! کل راج کرے گی'' (افسانہ ''مجبوری'')

مشتاق احمد وانی کے یہاں جمالیاتی لفظیات و واردات کا حسن و جمال بھی نظر آتا ہے۔ فکر و خیال کے تانے بانے بُننے میں ربط و عطف کی کاروائی عرض و جسم کے انجام تک اس طرح پہنچتی ہے:

''اس رات چندرا کا بدن جوانی کے نشے میں بہت مہک رہا تھا، جس رات وہ پیاری سی دلہن کے روپ میں ایک کمرے میں اپنا لباس فاخرہ اتار کر سوگئی تھی اور اس کا بوڑھا پتی پھول چند اکھڑتی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے بالکل قریب آگیا تھا۔ چندرا کو اسے دیکھ کر یوں لگا تھا کہ جیسے اس کے نانا بھول کر اس کے پاس آرہے ہیں۔ وہ ڈر و خوف کے مارے کانپ گئی تھی۔ پھر اس نے اپنے گورے بدن پر لڑکھڑاتے ہوئے ہاتھوں کی سرسراہٹ محسوس کی تھی۔ ایک بوڑھا وجود اس کے مخملی جسم سے لپٹ گیا تھا، لیکن لپٹتے ہی وہ آب نزول اور ذکاوت حس کی بیماری کی وجہ سے ایک طرف کو لڑھک گیا تھا۔ اس وقت چندرا نے یوں محسوس کیا تھا کہ جیسے وہ تپتے ہوئے صحرا میں اکیلی العطش العطش پکار رہی ہو''

(افسانہ ''مجبوری'')

مشتاق احمد وانی اسلام مذہب کے پیروکار ہیں اور اسلامی ادب کو بھی فروغ دینا چاہتے ہیں تاکہ یہودی سوچ اور صیہونی فکر زیادہ رائج نہ ہو۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بداعمالی، اخلاقی گراوٹ، جنسی بے راہ روی، بے حیائی و فحاشی، مال و زر کی حرص و ہوس،

صارفانہ ذہن کی پختگی، نسلی غرور وتکبر۔ کمزوروں کے ساتھ ناانصافی وزیادتی، حقوق انسانی کے دوہرے معیار، اپنے مخالفین کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے، جمہورت کے بہانے غاصبانہ قبضہ اور قتل وغارت گری کی گرم بازاری کی طرف اشارے کرکے تہذیب وتمدن کی نئی شکل کو منعکس کیا ہے جو بہرحال کریہہ ہے۔ مشتاق احمد وانی نے قرآن اور حدیث کے حوالے سے تعمیری اور متصوفانہ باتیں بھی کی ہیں:

''پاپا! ہم دنیا میں کہاں سے آئے ہیں اور کہاں چلے جائیں گے؟''

''کامران بیٹے! بہت اہم اور اچھا سوال پوچھا ہے تُم نے۔ سنو، اپنے سوال کا جواب: ہم پیدا ہونے سے پہلے عالم ارواح میں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی رضا اور قدرت سے اس دنیا میں پیدا فرمایا۔ یہ دنیا ہمارے لئے ایک امتحان گاہ ہے۔ خدا تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون میرا حکم مانتا ہے اور کون نہیں مانتا۔ زندگی ایک مختصر سا سفر ہے جس کا خاتمہ موت پر ہے۔ مرنے کے بعد ہم اپنے اچھے اعمال کی بنا پر بہشت میں داخل ہوں گے اور بُرے اعمال کی بنا پر دوزخ میں۔ یاد رکھو بیٹے! مرنے کے بعد بھی ایک نہ ختم ہونے والی زندگی ہے۔ جسم مٹی ہو جاتا ہے لیکن روح نہیں مرتی'' (افسانہ ''دل ودماغ میں گھومتی کیل'')

ہدایت ورحمت کی باتوں کو مشتاق احمد وانی اپنے افسانوں کے بطون میں اس طرح داخل کرتے ہیں کہ وہ کہانی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اسلامی تعلیمات، حق وصداقت پر مبنی ہیں۔ اصول وضوابط حقوق انسانی کے محافظ ہیں اور امن عالم کی ضمانت دینے والے ہیں اور انسانی دلوں میں گھر کرنے والے ہیں:

''رحمت علی پھر بولے ''چراغ بھائی! آپ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ ہم آپ کی رہبری چاہتے ہیں۔ سبھی گاؤں والے آپ کا دم بھرتے ہیں۔ ہر کوئی آپ کی بات مانتا ہے۔ خدا نے آپ کو ہر طرح سے نوازہ ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ دنیاداری کے ساتھ ساتھ دینداری کی طرف بھی توجہ دیتے تو سونے پہ سہاگہ ہوتا۔ یہ زندگی تو چند روزہ ہے

میرے بھائی! اصل زندگی تو مرنے کے بعد والی زندگی ہے، جو نہ ختم ہونے والی ہے۔ وہاں تو انسان کے نیک اعمال ہی اس کے کام آئیں گے۔ یہ مال و دولت، یہ دنیا کی آرائش و زیبائش تو وہاں بالکل کام نہیں آئے گی۔ وہاں کام آئے گی تو اللہ کے احکامات اور محمد ﷺ کے نورانی طریقوں پر گذاری ہوئی یہ زندگی۔ اس لیے ہم آپ سے مخلصانہ گزارش کرتے ہیں کہ پنج گانہ نماز کی پابندی کیجیے اور اس کے علاوہ دوسرے فرائض کو بھی ملحوظ نظر رکھیے جو اسلام نے ہم پر فرض کر دیے ہیں'' (افسانہ ''شرافت'')

مشتاق احمد وانی نے گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی اپنے افسانوں کے ذریعے پھیلائی ہے۔ دراصل مغربی تہذیب کا حیلہ و حربہ شتر بے مہار کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ ایسے میں زندگی کے ہر شعبہ میں مذہبی قانون کا پابند رہنا ضروری ہے۔ اسلام نے ایمان و عمل صالح پر زور دیا ہے، جس کی طرف کئی افسانوں میں واضح اشارے ملتے ہیں لیکن مشتاق احمد وانی کے موضوعات پابند نہیں ہیں۔ وہ غریبوں کے ساتھ بھی منصفانہ برتاؤ چاہتے ہیں۔ ان کے افسانے کا ایک موضوع یہ بھی ہے۔ باعزت زندگی کو تار تار ہوتے ہوئے وہ نہیں دیکھ سکتے اور سماجی و معاشی حقوق کی پامالی پر بھی کُڑھتے ہیں، جھنجھلاتے ہیں بھیک مانگنے کی لت و خواری پر یہ ردِ عمل دیکھیے:

''دے دو بھائی! روپیہ دو روپیہ ماتا کے نام پر'' دلدار صاحب نے لڑکی کو سر تا پا دیکھا تو ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے بھیک مانگنا ہمارے ملک کی ایک روایت بن چکی ہے۔ کام کرنے کی بجائے لوگوں نے بھیک مانگنا شروع کر دیا ہے۔ آخر اس لڑکی میں کون سی معذوریت ہے۔ صوفی، سنتوں، رشی، منیوں اور دیوی دیوتاؤں کا تقدس کتنا پامال ہو رہا ہے۔ ابھی وہ یہی سوچ رہے تھے کہ ڈفلی کی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ ایک سفید ریش آدمی سر پر ہرے رنگ کی ٹوپی، گلے میں موٹے منکے والی کالے رنگ کی مالا پہنے ڈفلی کی تال پر پُر جوش انداز میں گا رہا تھا ''دکھیوں کے ہیں مسیحا اجمیر والے

بابا'' بھکاری شخص نے دلدار صاحب کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا

''بادشاہو! کچھ نہ کچھ دے دو،اس پاپی پیٹ کا مسلہ ہے'' اس نے زور سے ہاتھ اپنے پیٹ پر مارا۔دلدار صاحب نے اسے بھی سرتاپا دیکھا تو دل مسوس کر رہ گئے!''

''چار چہرے'' مشتاق احمد وانی کا ایسا افسانہ ہے جس میں نوٹ بندی اور صفائی ابھیان کو موضوع بنایا گیا ہے۔وہ وقت کو پکڑنا جانتے ہیں اور اپنے دور کی آزمائشوں کو دیکھ کر تاریخ کے نئے باب کو آگے پیچھے کرنا جانتے ہیں۔حدوں کے تجاوز پر وہ طنز بھی کرتے ہیں اور فطرت اور جبلت کے انقلاب کو محسوس کرانے کا ہنر جانتے ہیں۔نوٹ بندی کی وجہ سے بینک کی لائن میں لگ کر'' چار چہرے'' میں ایک بُڑھیا کی موت ہو جاتی ہے۔ سچے واقعات کی تصویر کشی کرتے ہوئے مشتاق احمد وانی یہ بھی بتاتے ہیں:

''ایک دن اچانک شام ہوتے ہی اپنی مملکت میں بذریعہ الیکٹرانک میڈیا یہ حکم صادر کر دیا کہ آج رات بارہ بجے کے بعد 500 اور 1000 روپے کے نوٹ رد کر دیے جائیں گے اور ایک مقررہ مدت تک مسترد نوٹ بینکوں میں جمع کروائے جا سکتے ہیں۔یہ حکم نامہ سنتے ہی پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔رشوت خور طبقہ سب سے زیادہ تشویش اور بوکھلاہٹ محسوس کرنے لگا۔ہر عام آدمی اپنی جیب ٹٹولنے لگا 500 اور 1000 روپے کا نوٹ اس کے دل و دماغ پہ ہتھوڑے کا کام کرنے لگا''

مشتاق احمد وانی کی فکری ساخت انفرادیت رکھتی ہے۔انھوں نے آج کے کھوئے ہوئے انسان کے یقین کی تلاش کو اعتبار بخشا ہے۔اس طرح آگہی کی تہہ داری سامنے آتی ہے اور فریب نظر کی جہت پر ضرب لگتی ہے۔افسانہ'' قبر میں زندہ آدمی'' میں مرد کی فطرت اور داخلی کیفیت کو اندر کی عصبیت اور مذہبی اوصاف سے انفرادیت بخشی گئی ہے۔ یار خان کے پاس جب روپے کی ریل پیل ہوتی ہے تو دوسری بیوی لانے کی خواہش جاگتی ہے۔رجنی سے ان کی قربت بڑھتی ہے۔لیکن ایک حادثے نے ان کی فطرت بدل ڈالی اور

اندر کی کشمکش اور بیجا خواہش کو ذہن سے جھٹک دینے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ مشتاق احمد وانی کہانی کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

''یار خان، قومی شاہراہ پر ٹنل تعمیر کرنے والی ایک آسٹریلین کمپنی کے ساتھ اے کلاس ٹھیکدار تھے۔ روپے پیسے کو وہ ہاتھ کی میل سمجھتے تھے۔ شہر میں ان کا بہت بڑا امکان دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی منسٹر کی کوٹھی ہے۔ اس قدر رنگین مزاج تھے کہ دنیا کو دارالعمل کی بجائے دارالتفریح سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ام الخبائث کو صحت کے لیے مفید خیال کرتے تھے۔ تجربے اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہے کہ آدمی کے دل میں اگر ایمان کی رمق نہ ہو تو ایک بڑا عہدہ اور روپیہ پیسہ اس کو عیاش اور اللہ کا باغی بنا دیتے ہیں۔ یار خان کو روپے نے بہت حد تک عیاش اور اللہ کا باغی بنا دیا تھا۔ ان کی پندرہ لاکھ کی چمچماتی گاڑی دیکھنے والوں کا دل موہ لیتی تھی۔ ان کی بیوی حسینہ بیگم میٹرک پاس تھی۔ خوب صورت ہونے کے ساتھ خوب صورت بھی تھی۔ کہتے ہیں مرد کی ترقی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ حسینہ بیگم نے شادی کے بعد اپنے شوہر یار خان کا قدم قدم پر ساتھ نبھایا تھا۔ یار خان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سب کچھ کسی حد تک ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ اچانک یار خان پر ایک اور بیوی رکھنے کا جنون سوار ہوا۔ رجنی نام کی ایک گریجویٹ لڑکی ان پر فریفتہ ہو گئی''

(افسانہ ''قبر میں زندہ آدمی'')

انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پیش کرنے کے لیے مشتاق احمد وانی بڑا کینوس اختیار نہیں کرتے بلکہ ماحول کی یکسانیت کو برقرار رکھتے ہیں اور نئے سوالات یا مسائل نئی حسیت سے روشناس کراتے ہیں۔ جہاں تہذیب وثقافت کی وہ بات کرتے ہیں وہیں اسلامی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں تاکہ حقیقی سطح سامنے آسکے۔ افسانہ ''واپسی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''دیارام بولا ''مفتی صاحب حکم نہیں، عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں اسلام

قبول کرنا چاہتا ہوں اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں‘‘

مفتی صاحب حیران رہ گئے۔انھوں نے دیارام سے پوچھا’’ آپ کیوں اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’اس لیے کہ اسلام میں مجھے آفاقیت،صداقت اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ ہمارا سماج چونکہ فرقوں اور ذاتوں میں بٹ چکا ہے۔ مجھے فرقہ پرستی اور فرقہ بندی پسند نہیں ہے۔ مفتی صاحب! میں آپ سے یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مسلم سماج میں بھی اسلام کے نام پر فرقہ بندی ہے یا نہیں؟‘‘ مفتی صاحب کے وجود میں صداقت پسند دل ودماغ موجود تھا۔ پاسداری اور پردہ داری ان کے وجود کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ ان سے رہا نہیں گیا۔ انھوں نے کہا

’’سنیے، ہمارے یہاں بھی اسلام کے نام پر مختلف فرقے وجود میں آچکے ہیں۔ مثلاً سنّی ،شعیہ ،مالکی، حنبلی ،شافعی ،غیر مقلد ،دیوبندی اور بریلوی‘‘

مشتاق احمد وانی کا ایک افسانہ’’عورت‘‘ ہے جس میں انسانی رشتوں کے انہدام کا مرثیہ ہے۔رام دلاری پردہ کی قائل ہے۔اسے عورتوں کے لیے ضروری اور لازمی سمجھتی ہے۔وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ عورتیں ڈاکٹر بنیں،انجینئر بنیں،پائلٹ بنیں منسٹر بنیں اور دوسری ملازمت میں جائیں لیکن پردے میں رہ کر۔وہ دلیل دیتی ہے:

’’میں آپ کو یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ہمارے ملک میں عورتوں پر ظلم وستم ،ان کی خودکشی اور اغوا کی بنیادی وجہ ان کی بے پردگی ہے۔ اگر ہمارے ملک کی تمام عورتیں بلالحاظ مذہب وملّت پردے کو بطور تحفظ عزت وعصمت اپنائیں تو عورتوں سے جڑے ان تمام ظلم وزیادتیوں اور جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے جن کی وجہ سے پورا معاشرہ ایک طرح کی بحرانی صورت اختیار کر چکا ہے‘‘

دراصل رام دلاری، کی ایسی سوچ کی وجہ موبائل میں آنے والے میسج اور تصویریں

ہیں فیس بک پر فحش لٹریچر نے عورتوں کے لیے مصیبتیں کھڑی کررکھی ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے زندگی کے اضطراب کی جستجو کو انفرادی مفہوم سے برتا ہے۔ وہ اندھیرے میں زندگی تلاش کرتے ہیں وجود کی بازیافت کو ہم آہنگی بخشتے ہیں۔ وقت کے لمحہ تنہائی اور اجنبیت کی رفاقتوں کے نعم البدل کی جستجو ڈھونڈتے ہیں۔ تہذیبی، سیاسی، سماجی اور انسانی رشتوں کے زوال، اضطراب اور انتشار کو اظہار عطا کرتے ہیں اور روحانی بنیادوں کو اسلام مذہب کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان خوبیوں میں عہد کی تصویر کشی ہے۔ اسی لیے مشتاق احمد وانی کی افسانوی شخصیت میں کئی رنگ نمایاں ہیں۔

....

پروفیسر بیگ احساس
سابق صدر شعبۂ اردو، سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

مشتاق احمد وانی

مشتاق احمد وانی نے اپنی کہانیوں میں ایک پاکیزہ اور معصوم دنیا خلق کی ہے، انھوں نے موضوعات کا انتخاب تو اسی دنیا سے کیا ہے جس میں ہم سب سانس لے رہے ہیں۔ جیسے بہتر مستقبل کی تلاش میں نوجوانوں کا دیہاتوں کا شہروں کی جانب کوچ کرنا اور اپنی جڑوں سے کٹ جانا، بوڑھے ماں باپ کا بوجھ کی صورت اختیار کر لینا، ذات پات اور مسلکوں میں انسانوں کا بٹ جانا، خواتین سے چھیڑ چھاڑ، تعلیمی نظام کی خرابیاں، ماں کی کوکھ میں لڑکیوں کا خاتمہ، پردے کی اہمیت، فیتہ شاہی، جسم فروشی، نوٹ بندی، رشوت خوری وغیرہ۔ مشتاق احمد وانی کی اس دنیا کے امتیازات یہ ہیں کہ یہاں ایک خاتون پڑوسی کی مرغی چرا لیتی ہے اور پکڑے جانے پر واویلہ مچاتی ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پڑوسن اپنی کوکھ میں بچی ختم کروا رہی ہے تو انتقاماً اسے گرفتار کروا دیتی ہے۔ بس میں بدتمیزی کرنے پر ایک خاتون معمر مرد کی سات نمبر کی جوتی سے پٹائی کر دیتی ہے۔ فرائض سے غفلت برتنے والا ٹیچر حاضر دماغی سے نہ صرف بچ جاتا ہے بلکہ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ کا مستحق بھی قرار پاتا ہے۔ فیس بک استعمال کرنے والی جدید دور کی لڑکی کو پردے کی افادیت کا احساس ہو جاتا ہے۔ جسم فروشی کا اڈہ چلانے والی خاتون سلائی مشین لے کر پیشہ ترک دیتی ہے۔ اتفاقاً بیت الخلا بند ہو جانے والا شخص قبر کے تصور سے کانپ جاتا ہے اور راہ راست پر آ جاتا ہے۔ مشتاق احمد وانی کے تصورات کشمیری چشموں کی طرح شفاف ہیں۔ ان کے یہاں گناہ اور

ثواب کا تصور بہت واضح ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ فنکار ہیں۔انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کی روایت کی توسیع کی ہے۔ان کے افسانے کسی پیچیدہ صورت حال کو پیش نہیں کرتے۔ وہ روزمرہ واقعات سے کہانی کا خمیر تیار کرتے ہیں ان کے کردار سیدھے سادے ہیں۔ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہیں۔اس لیے وہ تحلیل نفسی سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ ان کا بیانیہ توضیحی ہے۔ وہ اشاروں کنایوں سے کام نہیں لیتے۔ ضرورتاً اشعار کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ان کی کہانیوں کی فضا کسی بھی قسم کی آلودگی سے پاک ہے۔ جہاں ضروری ہوتا ہے وہاں عمدہ منظر نگاری بھی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ بلکہ ان افسانوں میں پوشیدہ پیغام غیر محسوس طریقے پر اسے متاثر بھی کرتا ہے۔اب جب کہ اردو کے بیشتر قاری سوشل میڈیا کے ذریعے مطالعہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہ افسانے انھیں کتاب کی طرف راغب کرنے میں کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں۔

....

پروفیسر شہزادانجم
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی افسانوی کائنات

جموں وکشمیر کو خدا نے بے پناہ قدرتی دولت سے مالا مال کیا ہے لیکن وہاں کی فضا میں گذشتہ چند برسوں میں ایک زہر سا گھل گیا ہے۔ عام لوگوں کی زندگیاں مشکلوں سے دو چار ہوگئی ہیں۔ کشمیر کی اعلیٰ قدریں، روایات، تہذیب اور تاریخ سے گہری وابستگی وہاں کے باشندوں کی زندگی کا حاصل رہا ہے۔ کشمیر کے افراد کی ذہانت، ذکاوت، مہمان نوازی، خدا ترسی کی کوئی دوسری نظیر نہیں ہے۔ مگر بے انصافیوں کے خلاف احتجاج، سماجی استحصال کے خلاف آوازیں بلند کرنا اور عدم مساوات کے لیے قلم اٹھانا، یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کا شیوہ رہا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اسی صوبۂ جموں وکشمیر کے وہ اہم تخلیقی فنکار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی حقیقتوں کو بیان کیا ہے، اسی حوالے سے وہ انسانی رشتوں کی شکست وریخت اور کشمکش پر خاص زور دیتے ہیں۔ 'قبر میں زندہ آدمی' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں ان کے افسانے'' مجھے ایک دن گھر جانا ہے، انتظار مرگ، واپسی، حاضر جواب، انتقام، عورت، سب کی ماں، ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی، معاوضہ، کارخیر، چار چہرے، سات نمبر کا پاپوش اور قبر میں زندہ آدمی'' شامل ہیں۔ ان کی ہر کہانی کبھی صفائی سے اور کبھی سرگوشی میں کچھ کہہ گزرتی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان ہونے کا بنیادی حق ادا کرتے ہیں اور اس کی تحسین قدر انسانیت کے مضبوط، بلند اور اعلیٰ معیاروں سے کرتے ہیں۔ ان کی انسان دوستی

کی اساس تعقل پسندی پر ہے۔ان کا جذبہ پاک ،صاف اور ستھرا ہے۔ جواُن سے کچھ کہنے کی خواہش رکھتا ہے اوران سے نت نئی کہانی لکھواتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی موضوع کی مناسبت سے کہانی کو ایک نیا قالب دیتے ہیں۔جس سے ایک تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ان کی کہانیوں میں منفی کردار بھی ملتے ہیں اور نئے تجربات بھی۔زندگی کا سچ ان کے بطون میں آہستہ آہستہ پکتا ہے۔وہ خود کلامی کی تکنیک کو بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اردو افسانے کے افق پر چمکنے والے وہ درخشندہ ستارہ ہیں،جس کی روشنی نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کردیا ہے۔وہ ایک تازہ فکر اور حساس افسانہ نگار بھی ہیں جو اپنے افسانوں کے ذریعہ اپنے قارئین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ایک کامیاب تخلیقی فن کار،افسانہ نگار کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ مسائل کا حل نہیں بتائے بلکہ قارئین کے ذہنوں کو جھنجھوڑے اور انھیں سوچنے پر مجبور کرے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک ایسے ہی افسانہ نگار ہیں۔

بلاشبہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اہم شناخت رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ تازہ افسانوں کا مجموعہ قبولیت عام حاصل کرے گا۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

....

ڈاکٹر شریف احمد قریشی
رام پور (یو پی)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تخلیقی شاہکار ''قبر میں زندہ آدمی''

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری (جموں وکشمیر) ایک ایسے فنکار اور قلم کے سپاہی ہیں جو ادب کی مختلف وادیوں میں بے تکان محوِ سفر ہیں۔ اُنہیں افسانوی ادب سے خاص لگاؤ ہے اور وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی ہیں مگر تحقیق وتنقید کے میدان میں انہوں نے ایسے بلند پرچم نصب کر دیے ہیں جو ہمیشہ لہراتے رہیں گے۔ تحقیق وتنقید سے اُن کی دل چسپی کا عالم یہ ہے کہ آئے دن اُن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین مُلک اور بیرونِ مما لک کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کے مضامین کے کئی مجموعے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ آئینہ در آئینہ، اعتبار ومعیار شعورِ بصیرت اور ''افہام وتفہیم زبان وادب'' مقبولِ خاص وعام ہو چکے ہیں۔ اُن کا ایک اہم مجموعۂ مضامین ''تناظر وتفکر'' زیرِ اشاعت ہے۔ پی. ایچ. ڈی. ڈگری کے لیے قلم بند کیے گئے اُن کے تحقیقی مقالہ کا عنوان ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' ہے جس پر جموں یونیورسٹی، جموں نے انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے ایک اہم تحقیقی مقالہ بعنوان ''اُردو ادب میں تانیثیت'' قلم بند کیا جس پر ایم. جے. پی. روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی نے انہیں ڈی. لٹ. کی ڈگری سے سرفراز کیا۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے عہد کے ایک کامیاب، منفرد اور مقبول ومعروف

افسانہ نگار ہیں۔اُن کے افسانے نہ صرف اخبارات وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں بلکہ اُن کے کئی افسانوی مجموعے بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں جن میں سے ''ہزاروں غم'' میٹھا زہر'' اور''اندر کی باتیں'' کا شمار بہترین افسانوی مجموعوں میں کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر وانی کے افسانوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جموں یونیورسٹی، جموں نے کماری شکتی دیوی کو اُن کے تحقیقی وتنقیدی مقالہ بعنوان ''مشتاق احمد وانی بحیثیت افسانہ نگار'' اور یونیورسٹی آف حیدرآباد نے ارشد کو چھے کواُن کے تحقیقی وتنقیدی مقالہ بعنوان ''مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری'' پر ایم.فل.کی ڈگریوں سے سرفراز کیا ہے۔اس کے علاوہ دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور نے محمد حسین وانی کو دسمبر ۲۰۱۸ء میں ''مشتاق احمد وانی حیات اور ادبی خدمات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی نے ۱۵ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو یوم تاسیس کے موقعے پر ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کو ممتاز محقق ایوارڈ سے بھی نوازا۔''قبر میں زندہ آدمی'' اُن کے تازہ افسانوں کا تازہ انتخاب ہے۔اس کے علاوہ اُن کے کئی افسانوی مجموعے اشاعت کی منزل سے ہم کنار ہونے کے قریب ہیں۔

''قبر میں زندہ آدمی'' کے افسانے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہر افسانہ میں عہدِ حاضر کا ایک ایسا زندہ جہان آباد ہے جس کا ہر کردار اپنے عہد کی اخلاقی بدحالی، روحانی بحران، فرقہ واریت، مذہبی منافرت، دہشت گردی، بربریت، تنگ نظری و غارت گری کا ترجمان اور سیاسی، سماجی، معاشرتی و اقتصادی مسائل و حالات کا عکاس ہے۔

جس طرح ملکی اور سماجی حالات نہایت سرعت سے تبدیل ہورہے ہیں۔اُسی طرح ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی افسانوی دنیا میں بھی تبدّل وتغیرات ہوتے جارہے ہیں۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے اُن کے سابقہ اور حالیہ افسانوں میں شاید اس لیے فرق نظر آرہا ہے کہ وہ ایک دیدۂ بینا دانشور اور حسّاس فنکار ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات و

مسائل کا نہ صرف گہرائی و گیرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ ایک حساس فنکار کی طرح اثر بھی قبول کرتے ہیں اور پھر یہی اثرات الفاظ کا جامہ پہن کر افسانوں کے پیکروں میں ڈھل کر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تازہ ترین افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کی عکاسی نہایت سلیقے سے پُراثر انداز میں کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں زندگی کے خارجی اور داخلی عناصر کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔ دراصل اُن کے یہاں مقصدیت ہی کہانی کے روپ میں ڈھل جاتی ہے مگر وہ مقصدیت کو فن پر غالب نہ ہونے دینے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر مقصدیت ہے کہ اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

''قبر میں زندہ آدمی'' اس عہد کے ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس کی آنکھوں کو سیم وزر کی چمک دمک نے چکاچوندھ کر دیا ہے۔ ساٹھ سالہ یار خان پُل تعمیر کرانے والی ایک آسٹریلین کمپنی کے ساتھ اے کلاس کا ٹھیکیدار ہے۔ مذہب سے دوری اور دولت کی ریل پیل کے سبب وہ دارالعمل کو دارالتفریح اور اُم الخبائث کو اُم الصحت سمجھتا ہے۔ وہ اس قدر نفس پرست اور رنگین مزاج ہے کہ اپنی اہلیہ حسینہ بیگم اور چار بچوں کے مستقبل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے رجنی پر اس قدر فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اکثر اُس سے فون پر باتیں کرتا رہتا ہے۔ جب حسینہ بیگم کو پتا چلتا ہے تو وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کچھ سمجھنے کے بجائے کہتا ہے: ''اسلام میں تو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے'' یار خان کے یہ دل سوز اور جاں کاہ کلمے سُن کر حسینہ بیگم سے چُپ نہیں رہا جاتا۔ وہ اپنے شوہر سے اس طرح گویا ہوتی ہے:

''آپ نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، عشرہ و زکوٰۃ کا آپ کو پتا نہیں۔ اللہ نے آپ کو خود کفیل بنایا ہے اور روپے پیسہ کی بہتات ہے لیکن آج تک آپ کو حج و عمرہ کا خیال نہیں آیا۔ بس صرف آپ کو اتنا یاد ہے کہ اسلام میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔''

کچھ عرصہ کے بعد یار خان اپنے بھتیجے کی شادی کی تقریب میں شہر کے ایک عالی شان جنج گھر میں مَوج مستی کر رہا تھا کہ اُس کے پیٹ میں زبردست فتور پیدا ہوا۔ وہ نہایت

سرعت کے ساتھ ایک بیت الخلا میں گیا اور جاتے ہی اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ دروازے کا ہینڈل ٹوٹ گیا تھا اس لیے دروازہ کا کھلنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ اُس نے اپنی مدد کے لیے لوگوں کو اندر سے پکارا مگر ناچ گانے اور باجے گاجے کے شوروغل کے سبب اُس کی آواز کسی کے کان تک نہ پہنچ سکی۔ اُس نے اپنے کئی رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں سے فون کے ذریعہ رابطہ قائم کرنا چاہا مگر کسی سے بات نہ ہوسکی۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے مَوت کے فرشتے کو اپنی رگِ گلو سے نزدیک محسوس کررہا تھا اور بیت الخلا کو ایک ایسی قبر تصور کرنے لگا تھا جس میں وہ زندہ دفن ہوچکا ہے۔ اب اُسے دولت و امارت کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی تھی۔ نفس پرستی، عیّاشی اور جنسی خواہشات اُس کے دل و ذہن سے محو ہوچکی تھیں۔ اتفاقاً حسینہ بیگم کا وہاں سے گزر ہوا تو اُس نے بیت الخلا کے اندر سے دستک دینے کی آوازیں سُنیں۔ اس کے بعد اُس نے آناً فاناً لوگوں کو اکھٹا کیا اور مارتوڑ کے ذریعہ دروازہ کو توڑا گیا۔ اس طرح اُس نے اپنے شوہر کو زندہ بچالیا۔ اس عبرت ناک اور جان لیوا واقعہ کا اُس کے دل و دماغ پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ بیوی بچّوں کا خیال رکھنے کے ساتھ نیک کاموں کی طرف مائل ہوگیا۔ اُس نے فون کے ذریعہ رجنی سے بات کرنا بند کردی تھی مگر رجنی تھی کہ بار بار اُسے فون کرتی تھی۔ ایک روز تنگ آکر اُس نے اپنے موبائل فون کا سم کارڈ ہی بدل دیا۔

''یار خان نے تنگ آکر اپنے موبائل فون کا سم کارڈ بدل دیا۔'' اس افسانہ کا نہایت اہم، کلیدی اور علامتی جملہ ہے۔ افسانہ نگار نے تمام کہانی بُننے کے بعد علامتی پیرائے میں اشارہ کیا ہے کہ اگر زندگی کے خراب سم کارڈ کو تبدیل کردیا جائے تو انسان کی زندگی بھی خوش گوار ہوجائے گی اور اس کی عافیت بھی سنور جائے گی۔

کسی شاعر کا خوب صورت اور فکر انگیز شعر ہے۔

خوب صورت، اُداس، خوف زدہ
تو بھی ہے بیسوی صدی کی طرح

بیسوی صدی سے کہیں زیادہ اکیسویں صدی خوب صورت، اُداس اور خوف زدہ ہے۔ بیسوی صدی میں جس تیزی کے ساتھ حیرت انگریز کارنامے رونما ہوئے ہیں اور ترقّی کے جو مراحل طے ہوئے ہیں اُن کا تصور بھی آسانی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بیسوی صدی کے مقابلہ میں اکیسویں صدی کی برق رفتاری ہزاروں گُناہ زیادہ ہے۔ اس صدی میں پے در پے جو ہمہ جہت ترقّیات ہو رہی ہیں انہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ صدی تمام سابقہ صدیوں کی بہ نسبت نہ صرف تیز تر ہے بلکہ ہر پل بدلتے ہوئے حالات کے اعتبار سے بھی عجیب وغریب ہے۔ حضرتِ انسان نے گلوبلائزیشن کے اس دَور میں جس قدر مادی ترقّیات کی ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ معاشی، اقتصادی، معاشرتی، سیاسی، روحانی اور اخلاقی بحران ومسائل سے دو چار ہے۔ عہدِ حاضر میں ظلم، تشدّد، بربریت، فرقہ واریت، مذہبی منافرت کا جس قدر ننگا ناچ ہو رہا ہے اس سے قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ عام انسانوں کی بہ نسبت فنکار زیادہ حسّاس ہوتے ہیں۔ وہ معمولی واقعات سے بھی نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ اُن کے اظہار کے لیے بے چین بھی رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک دیدہ ور شریف انسان اور حسّاس فنکار ہیں۔ انہوں نے عہدِ حاضر کے درج بالا تلخ وشیریں حقائق کو محسوس بھی کیا ہے اور بھگتا بھی ہے۔ وہ محض ساحل کے تماشائی نہیں بلکہ ایک ایسے شناور ہیں جو غرقِ آب ہو کر اُبھرنے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے عہدِ حاضر کے حالات ومسائل کے بہترین ترجمان ہیں۔ وہ صرف موجودہ دَور کے مسائل ہی کی عکاسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ تجربات ومشاہدات، احساسات ونظریات اور افکار وخیالات کو بھی نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کر کے قارئین کی توجہ کو مبذول کراتے ہیں۔ بطورِ مثال پیشِ نظر ہیں ان کے افسانوں سے اخذ کیے گئے چند ایسے فقرے اور جملے جو اُن کے نظریات وخیالات کے بہترین عکاس ہیں:

''اِلکٹرانک میڈیا نے عورت کو بطورِ نمائش ایک طرح کی عالمی منڈی میں لا کھڑا

کیا ہے جوروز افزوں ایک تشویش ناک مسئلہ بنتا جارہا ہے'' (افسانہ:عورت)

''اسلام میں مجھے آفاقیت،صداقت اور یکسانیت نظر آتی ہے'' (افسانہ: واپسی)

''ہم ہندو اور مسلمان بعد میں ہو سکتے ہیں، پہلے ہمارا انسانی اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے'' (افسانہ: معاوضہ)

ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ طویل جدّ وجہد کے بعد مُلکِ ہند کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے والے، مُلک کی تقسیم کے سبب دو بڑے گروپ میں بٹ گئے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور جانی دشمن ہو گئے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور باہمی تصادم نے پورے مُلک میں زلزلہ جیسی صورت پیدا کر دی تھی جس کے ہلکے پھلکے اور شدید جھٹکوں کا سلسلہ آج بھی تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ دیگر حسّاس فنکاروں کی طرح ڈاکٹر مشتاق احمد وانی بھی مذہبی بے زاری اخلاقی بحران اور مُلک کے دگرگوں حالات و مسائل کے سبب برگشتگی، ہیجان واضطراب میں مبتلا رہتے ہیں جس کا ثبوت اُن کی کہانیاں اور بالخصوص تازہ افسانوی مجموعہ ''قبر میں زندہ آدمی'' کے افسانے ہیں۔ اُن کے افسانہ ''سب کی ماں'' کی بہاراں دائی دردِزہ سے تڑپتی ہوئی ہر مذہب وملّت کی عورتوں کے بچّے پیدا کراتی ہے۔ بچّے پیدا کرانا اُس کا پیشہ نہیں بلکہ جذبۂ خدمتِ خلق ہے۔ وہ مشترکہ تہذیب، باہمی اتحاد ویگانگت کی جیتی جاگتی علامت ہے۔ وہ قومی ہم آہنگی اور مشترکہ تہذیب ومعاشرت کا ایسا استعارہ ہے جس کی بہاریں چند سابقہ دہائیوں میں ہندوستان کے ہر گاؤں، ہر قصبہ اور ہر شہر کی فضا کو ہر وقت خوش گوار بنائے رکھتی تھیں۔ افسانہ نگار کو اسی مشترکہ تہذیب کی علامت کے بکھرنے اور آئے دن طرح طرح کے ہونے والے اذیت ناک آپریشن کا ڈر ستاتا رہتا ہے۔ وہ بہاراں کی مَوت سے متاثر ہو کر کہتا ہے:

''بہاراں دائی کی مَوت ہم سب کی مَوت ہے کیوں کہ اب ہمارے قصبہ کی کوئی بھی عورت بغیر آپریشن کے بچّہ نہیں جنے گی۔''

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا مشاہدہ بھی وسیع ہے اور مطالعہ بھی۔ انہوں نے دیگر قلم کاروں کی نگارشات کے علاوہ سر سیّد احمد خان کی تحریروں کا بھی بہ غائرِ نظر مطالعہ کیا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کرتے ہوئے انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے جلسہ میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے سر سیّد احمد خاں نے کہا تھا کہ ''مَیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔''

اسی طرح سب کی ماں بہاراں دائی اپنے قصبہ کے لوگوں سے رقّت آمیز لہجہ میں اس طرح گویا ہوتی ہے:

''تم سب کو اپنے خاندان کے لوگ سمجھتی ہوں۔ میرے ہاتھوں تمہارا جنم ہوا ہے۔ میری آنکھوں نے تمہارا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ دیکھا ہے اور اس عمر میں اب تمہارا بڑھاپا دیکھ رہی ہوں۔ مَیں خود اب ڈوبتے سورج کی کرن کی مانند ہوں۔ دنیا کی سب سے انمول نعمت دل کا سکون ہے۔ اتفاق و اتحاد کی نعمت کو نہ کھونا۔ میرے قصبہ میں رہنے والے مسلمان اور ہندو میری آنکھیں ہیں، سکھ اور عیسائی میرے بازو۔ کل جن بچّوں نے غلط حرکت کی ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے معافی مانگیں اور ایک دوسرے کے ساتھ گلے ملیں ورنہ مجھ بوڑھی کا دل روتا رہے گا۔''

''واپسی'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں بڑے سلیقہ سے واضح کیا گیا ہے کہ جس طرح ہندو سماج فرقوں اور ذاتوں میں تقسیم ہوگیا ہے اُسی طرح مذہبِ اسلام کے نام پر سُنّی، شیعہ، مالکی، حنبلی، شافعی، غیر مقلّد، دیوبندی، بریلوی جیسے فرقوں اور مسلکوں کا وجود میں آنا باعثِ تشویش و تباہی ہے۔ یہ افسانہ ہر باشعور، سنجیدہ اور مخلص قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور وہ ذات پات، فرقہ بندی اور مسلکی تفریق جیسی لعنتوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ ان کی فکر

مثبت اور صالح ہے۔ اُن کے ہر افسانے میں کوئی اصلاحی اور سودمند پیغام ضرور ہوتا ہے جسے وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے ہر قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی اور اس سے بڑھ کر ادب برائے مقصد کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی بیشتر نگارشات کے بین السطور میں کسی اصلاحی پیغام یا سودمند مقصدیت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے نزدیک مذہب سے بے زاری، باہمی نفاق اور مادہ پرستی کے بڑھتے رجحان نے اخلاقی قدروں کو پامال اور حضرتِ انسان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے جس کی ترجمانی انہوں نے اپنے افسانہ ''معاوضہ'' کے ذریعہ نہایت سلیقہ سے کی ہے۔ دھرم چند اور کرم دین دو مختلف مذاہب کے کردار ہیں۔ ہندی کے پروفیسر دھرم چند اور اُردو کے نامور ادیب کرم دین دو مختلف مذاہب کے ہوتے ہوئے بھی گہرے دوست ہیں۔ دس سال کے طویل عرصہ کے بعد جب ان کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں تو افسانہ نگار کہتا ہے:

''دونوں گہرے دوست بڑے پُر تپاک انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بغل گیر ہوئے کہ جیسے فرقہ پرستوں کو یہ سبق سکھا رہے ہوں کہ ہم ہندو اور مسلمان بعد میں ہو سکتے ہیں، پہلے ہمارا انسانی اوصاف سے متصف ہونا نہایت ضروری ہے۔''

اس افسانہ میں جب دھرم چند اپنے دوست کرم دین سے پوچھتا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ اس بار بھی اُس کی تقرری اُردو پروفیسر کی پوسٹ کے لیے نہ ہو سکی تو وہ رشوت خوری اور بدعنوانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میرے پاس تو حید و رسالت کی عظمت و فضیلت، پانچ وقت کی نمازوں کی ٹھنڈک، رمضان المبارک کے تیس روزوں کا تقویٰ، عشرہ و زکوٰۃ کی اہمیت و افادیت اور حج و عمرہ کی تمنا تھی۔ چناں چہ دو متضاد طبیعتوں کے تصادم میں بُری طرح مجھ سے میرا حق چھینا گیا۔''

افسانہ ''ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی'' میں بھی رشوت خوری اور بدعنوانی کی عکاسی کے

ساتھ یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ لوگ زبردست اور ظالم شخص سے مرعوب ہوتے ہیں، اُس کی خوشامد کرتے ہیں اور اسے جھک کر سلام بھی کرتے ہیں اور شریف و سادہ لوح انسان کو سُکھ چین سے جینے بھی نہیں دیتے۔ افسانہ ''انتظارِ مرگ'' اُن کلجگ کی اولادوں اور مغربی تہذیب کے دلدادہ بے راہ رو نوجوانوں کی نفسیات کا عکاس ہے جو بزرگوں اور والدین کو محض بار سمجھتے ہیں اور گھر کے کوڑا کرکٹ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہی نہیں وہ انہیں خود سے جدا کرنے یا ان کے مرجانے کی فکر میں رات دن مبتلا رہتے ہیں۔ چار چہرے، کارِ خیر، عورت اور سات نمبر کا پاپوش کے ذریعہ مذہبی منافرت، فرقہ پرستی، بدعنوانی، خود غرضی، نفرت، تعصب، مفاد پرستی اور استحصال کو مُلک و قوم اور انسانیت کے لیے سمِ قاتل قرار دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں کی تعداد اور موضوعات کی نوعیت سے واضح ہے کہ دنیائے آب و گِل کے اخلاق سوز ہنگاموں کے ظاہری عوامل اور اُن کے ذریعہ مرتب ہونے والے باطنی اضطراب و متلاطم جذبات اُن کے قلم کی روانی کو ماند نہیں ہونے دیتے۔ مثبت فکر، حسّاسیت و جذباتیت اور تخلیقی صلاحیت کے سبب اصلاحی اور مقصدی فن پارے تخلیق کرنا اُن کی مجبوری نہیں بلکہ ایک مشن اور کارِ خیر ہے۔ افسانہ ''مجھے ایک دن گھر جانا ہے'' کی چھوٹی سی زرّیں اپنے والد محسن میاں سے کہتی ہے کہ ''ممّی کہہ رہی ہیں کہ مکان کی پانچویں منزل تعمیر کرانے کا انتظام کیجئے کیوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر کھولنا ہے جس کے جواب میں وہ کہتے ہیں: ''بیٹی! ممّا سے کہیے کہ پاپا کہہ رہے ہیں مجھے ایک دن گھر جانا ہے۔'' ''مجھے ایک دن گھر جانا ہے'' نہایت فکر انگیز، دل و ذہن کو جھنجھوڑنے، عملِ صالح اور توشۂ آخرت کی طرف متوجہ کرنے والا جملہ ہے۔

اسلام سے قبل زمانۂ قدیم میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ جو لڑکیاں بچ جاتی تھیں اُن کی حیثیت محض لونڈی، باندی اور ایک جنس کی سی تھی۔ ''عورتوں کو برابری کا درجہ حاصل ہے۔'' کے اس عہد میں بھی اس مسئلہ کا خاتمہ نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا روپ بدل

گیا ہے۔اب بھی سماج کا ایک طبقہ اُن عورتوں کے حمل کا اسقاط کرا دیتا ہے جن کے بطن میں لڑکیاں ہوتی ہیں۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا افسانہ ''انتقام'' اسی غیر فطری فعل اور سماجی بُرائی کو جڑ سے ختم کرنے کی طرف اپنے قارئین کو متوجہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے تمام افسانوں کے موضوعات سماجی زندگی کے تلخ وشیریں حقائق پر مبنی ہیں۔وہ روزمرّہ کی زندگی میں رونما ہونے والے مسائل اور اخلاق سوز واقعات سے اپنے افسانوں کے پلاٹ اخذ کرتے ہیں۔اُن کی نگارشات یک رنگی نہیں بلکہ مختلف النوع پہلوؤں اور ہمہ جہت موضوعات کی حامل ہیں۔اُنہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ اعلیٰ اقدار کی پامالی،بدعنوانی، بےراہ روی،مذہب سے بےزاری اور رشتوں کے تقدّس کے زوال کو فنکارانہ چابک دستی سے منعکس بھی کیا ہے اور ان کے تدارک کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔وہ افسانے کے آغاز واختتام، بیانیہ اور مکالماتی اسلوب، وحدتِ تاثر اور منظر نگاری کے ذریعے اپنے فن پاروں کو پُراثر بنانے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ پیشِ نظر ہے اُن کے افسانہ بعنوان ''معاوضہ'' کے آغاز کا یہ منظر:

''جاڑے کا موسم تھا۔دوپہر کے تین بج چکے تھے۔آسمان پہ بادل سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔وہ کبھی سورج کو اپنی آغوش میں چھپا لیتے اور کبھی سورج اپنی تمازت سے اُنہیں دور بھگانے میں کامیاب ہو جاتا''

درج بالا مناظر کے ساتھ جوشؔ ملیح آبادی کی نظم ''شکستِ زنداں کا خواب'' میں بیان کیے گئے مناظر نگاہوں میں پھرنے لگتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرّانے لگا
اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بےنور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی، سُلجھا تو ضیا برسانے لگا

فن کوئی بھی ہو ریاضت و مشقت کے بغیر نہ تو مہارت حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ شہرت و بلندی کی منزلوں کو سر کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی عہد حاضر کے ایک ایسے فنکار ہیں جن کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور مشاہدہ بھی۔ وہ درس و تدریس کے ساتھ مشق و مزاولت بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دیگر فنکاروں کے فن پاروں کے پسندیدہ جملوں، فقروں یا اشعار کو کبھی جیوں کا تیوں اور کبھی معمولی تحریف و ترمیم کے ساتھ اپنی تخلیقات میں اس طرح سموتے ہیں کہ زور واثر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ فلم سندور میں نغمہ نگار آنند بخشی کے گیت

پت جھڑ، ساون، بسنت بہار
ایک برس کے موسم چار
پانچواں موسم پیار کا، انتظار کا

سے متاثر ہو کر ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

ایک برس کے چار موسموں کا لطف تو وہ اُٹھا چکے تھے لیکن پیار کا یہ پانچواں موسم اُنہیں حیرت زدہ کیے ہوئے تھا۔ (افسانہ: مجھے ایک دن گھر جانا ہے)

بشیر بدر کے شعر

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

سے متاثر ہو کر مشتاق احمد وانی اپنے افسانہ ''کارِ خیر'' کا ایک جملہ اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

''یہ زندگی تمہیں ایک بار ملی ہے محض اللہ کی بندگی کے لیے، اس بُرے کام کے لیے نہیں۔ اس لیے زندگی کو غنیمت جانو، کیا معلوم کہاں زندگی کی شام ہو جائے۔''

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنی نگارشات کے لیے جہاں روزمرّہ کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و مسائل سے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہیں کہاوت، قصص،

حکایات وغیرہ کے سودمند اور دل کو چھو لینے والے خیالات ومفاہیم کو بھی نہایت چابک دستی سے افسانوں کے پیکر میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ طبع زاد تخلیق کا گمان ہونے لگتا ہے۔ میری کتاب ''کہاوت اور حکایت'' میں ایک مشہور کہاوت کا عنوان ہے: دنیا کو کسی طرح چین نہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا افسانہ ''سماج'' اگر چہ اس مجموعے میں شامل نہیں ہے لیکن میں نے اسے ایک معیاری رسالہ میں پڑھا ہے اسی کہاوت کے پس منظر پر مبنی ہے۔ اس افسانہ کے دو اہم کردار کا رام اور اُس کا چھوٹا بیٹا بسنت راج ہیں۔ یہ دونوں ایک گدھا خرید کر اپنے گھر کی طرف پیدل چل دیتے ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کس قدر احمق ہے کہ گدھا ہوتے ہوئے بھی پیدل چل رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی بیٹا اپنے باپ کو گدھے پر سوار کر دیتا ہے۔ یہ کچھ دور ہی چلے ہوں کہ کچھ لوگ پھر کہتے ہیں کہ باپ کس قدر بے رحم ہے کہ خود تو گدھے پر سوار ہے اور بیٹا پیدل چل رہا ہے۔ یہ سُنتے ہی باپ نے اپنے بیٹے کو گدھے پر بٹھا دیا اور خود پیدل چلنے لگا۔ ابھی وہ کچھ دور ہی چلے تھے کہ کسی نے بیٹے سے کہا: تجھے شرم نہیں آتی، خود تو گدھے پر سوار ہے اور باپ پیدل چل رہا ہے۔ اس کے بعد ان کے ذہن میں ایک تدبیر سوجھی۔ اُن دونوں نے گدھے کو اپنے کاندھوں پر رکھ لیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

مذکورہ کہاوت اور افسانہ کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا یا سماج کو کسی طرح بھی چین نہیں ملتا۔ لوگ اچھے خاصے انسانوں اور اس کے عمدہ کاموں میں بھی بے وجہ عیوب اور نقائص نکال کر تشہیر کرتے رہتے ہیں۔

ادبی تحریروں سے روزمرّہ، محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال کا بتدریج فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری زبان بڑی حد تک کتابی ہو گئی ہے۔ اگر تحریر وتقریر میں محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال سلیقے سے کیا جائے تو نہ صرف ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے بلکہ زور واثر میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے نہایت صفائی، سادگی اور

برجستگی سے محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال کر کے اپنی نگارشات کے حُسن کو دوبالا بھی کیا ہے اور انہیں اثر انگیزی بھی عطا کی ہے۔ پیشِ نظر ہیں ان کے تازہ افسانوں سے اخذ کیے گئے چند ایسے جملے جن میں بڑی فنکارانہ چابک دستی سے عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، نیکی اور پوچھ پوچھ کے، نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، ایک تو چوری اور اس پہ سینہ زوری، سیدھی اُنگلی سے گھی نہیں نکلتا، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے جیسی کہاوتوں کو نگینوں کی طرح جڑ دیا گیا ہے:

''اچانک یار خان پر ایک اور بیوی رکھنے کا جنون سوار ہوا۔ رجنی نام کی ایک گریجویٹ لڑکی اُن پر فریفتہ ہوگئی۔ وہ بھی اس کے خوابوں اور خیالوں میں اپنی صبح کو شام کرنے لگے۔ بزرگوں کا قول عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ایسا ہی معاملہ یار خان کے ساتھ بھی ہوا'' (افسانہ: قبر میں زندہ آدمی)

''مَیں ایک ایسا دینی مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں جس میں دینی و دنیوی علوم کی تدریس ہو اور اس میں صرف یتیم بچے تعلیم حاصل کریں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ مفتی صاحب خوش ہوئے۔ اُنہوں نے کہا: جناب! نیکی اور پوچھ پوچھ کے، آپ کا ارادہ نیک ہے اس لیے اسے عملی جامہ پہنایئے'' (افسانہ: قبر میں زندہ آدمی)

''نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔ رام دلاری پہ یہ ضرب المثال صادق آتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تو تھی ہی لیکن جب اس نے بناؤ سنگھار کے بعد قد آدم آئینے کے سامنے اپنی آرائش و زیبائش کے تمام زاویے درست کیے تو اس کی جمالیاتی حس جاگ اُٹھی۔ اُسے اپنا آپ ایک اُپسرا کی مانند دکھائی دینے لگا'' (افسانہ: عورت)

''مہر افروز بادلِ ناخواستہ اپنے شوہر کی بات مان گئی۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی پوری گفتگو پڑوسن سن رہی تھی۔ اُس نے اُن کی تمام باتیں اپنے موبائل فون میں ریکارڈ کر لیں اور دوسرے دن اُس نے پولس اسٹیشن

جا کر تھانیدار کو نوید الرحمٰن اور مہرافروز کے منصوبے سے آگاہ کر دیا‘‘ (افسانہ: انتقام)

’’دیکھئے اس عورت کو ایک تو چوری اور اس پہ سینہ زوری۔ پڑوسن نے بھی اُسے ایک بھدّ ی سی گالی دی اور چند لمحوں کے بعد ماحول ٹھنڈا پڑ گیا۔‘‘ (افسانہ: انتقام)

’’اگر کسی نے میرا حق چھیننے کی کوشش کی یا کوئی زیادہ ہوشیاری دکھانے لگا تو پھر مَیں ڈنڈے اور کالی سفید گالیوں سے کام لیتا ہوں کیوں کہ سیدھی اُنگلی سے گھی نہیں نکلتا یا پھر آپ نے یہ مشہور ضرب المثل سنی ہوگی کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے‘‘

(افسانہ: ہاتھ میں ڈنڈا مُنہ میں گالی)

اور اب دل توڑنا، دم گھٹنا، آنکھوں میں خون اُتر آنا، ٹھنڈا پڑ جانا، اُمّید سے ہونا، ٹوٹ پڑنا، جی اوب جانا، نظریں چرانا، اینٹ کا جواب پتّھر سے دینا، ناک میں دم کر دینا جیسے محاوروں کا برمحل و برجستہ استعمال بھی ملاحظہ فرمایئے

’’مَیں رجنی کا دل توڑنا نہیں چاہتا اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا۔‘‘ (افسانہ: قبر میں زندہ آدمی)

’’ایک بار مجھ پہ اپنی رحمت و بخشش کی نگاہ ڈالیے۔ یا اللہ میری مدد فرمایے، میرا دم گھٹا جا رہا ہے‘‘ (افسانہ: قبر میں زندہ آدمی)

’’مہرافروز کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اس نے محلّے کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: دیکھئے اس عورت کو ایک تو چوری اور اس پہ سینہ زوری۔ پڑوسن نے بھی اُسے ایک بھدّ ی سی گالی دی اور چند لمحوں کے بعد ماحول ٹھنڈا پڑ گیا‘‘ (افسانہ: انتقام)

’’نوید الرحمٰن کی چھوٹی چھوٹی تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ مہرافروز اب کے برس بھی اُمّید سے تھی‘‘ (افسانہ: انتقام)

’’اُس کے اس منفی رویّے سے چند نوجوان اُس پر ٹوٹ پڑے۔ اب اُسے کوئی مُکّے مار رہا تھا اور کوئی تھپڑ۔ گویا یہ ظاہر کر رہے ہوں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں

مانتے'' (افسانہ: چار چہرے)

''جب اُس کا جی رام دلاری سے اوب گیا تو اس نے دھیرے دھیرے اُس سے نظریں چرانا شروع کر دیا'' (افسانہ: عورت)

''بات رفع دفع کرنے کی نہیں ہے بابا! اینٹ کا جواب پتھر سے دینا سیکھئے۔'' (افسانہ: واپسی)

''ان بندروں نے پورے قصبہ کے لوگوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ بندر گھروں میں گھستے تھے اور اندر سے کپڑے، کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے تھے اور بعض بوڑھوں اور بچّوں پہ جھپٹ پڑتے تھے'' (افسانہ: سب کی ماں)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نہ تو واعظ ہیں نہ ذاکر اور نہ مبلغ مگر ایک مفکر اور دردمند انسان ضرور ہیں۔ وہ باتوں ہی باتوں میں اپنے قارئین کو ایسے پُر مغز، حکیمانہ اور سودمند نکتوں سے آگاہ کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں جنہیں صداقت و دانائی اور ادراک و عرفان کے جواہر پارے کہا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''جوش میں ہوش کھونا اچھی بات نہیں ہے'' (افسانہ: واپسی)

''عورت ذات کا من بڑا چنچل اور تن کومل ہوتا ہے'' (افسانہ: عورت)

''زیادہ شریف بن کر رہیں گے تو سماج کے بُرے لوگ آپ کے کپڑے بھی اُتار لے جائیں گے'' (افسانہ: ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی)

''ماں باپ اپنے بچّوں کو اپنا خون پلا کر جوان کرتے ہیں اور پھر جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو ماں باپ کو بھول جاتے ہیں'' (افسانہ: مجھے ایک دن گھر جانا ہے)

''حرام کی کمائی سے آدمی کو آرام نہیں ملتا'' (افسانہ: مجھے ایک دن گھر جانا ہے)

''دوست یار سب مطلب کے یار ہوتے ہیں'' (افسانہ: کارِ خیر)

''لباس کتنا ہی قیمتی اور خوب صورت کیوں نہ ہو وقت اُسے مَیلا کر دیتا ہے'' (افسانہ: کارِ خیر)

''جب کسی مرد کا دل سیاہ اور آنکھیں میلی ہو جاتی ہیں تو پھر اُس کے دل و ذہن سے کسی کی ماں، بہن، بیٹی کو اپنی ماں، بہن، بیٹی سمجھنے کا جذبہ رُخصت ہو جاتا ہے''

(افسانہ: سات نمبر کا پاپوش)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی افسانوی نگارشات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مادّیت پرستی، فرقہ بندی، مذہبی منافرت اور مذہب سے بیزاری کے اس عہد میں لوگوں کو دینی احکام و فرائض سے آگاہ کرنے کو اپنا فرضِ اوّلیں سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اُن کی بیشتر نگارشات آیاتِ قرآنی، احادیثِ رسول کے مفاہیم اور دین کی باتوں سے مزیّن و مملو نظر آتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

''لمحہ بھر کے لیے اُن کے ذہن میں عالمِ برزخ، منکر نکیر، روزِ محشر، میزانِ عمل، اعمال نامہ، پُل صراط، جہنّم اور جنّت کے مناظر گھوم گئے'' (افسانہ: معاوضہ)

''ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا اور اُسی میں ایک دن لوٹائے جاؤ گے اور قیامت کے دن اس مٹی سے اُٹھائے جاؤ گے'' (افسانہ: معاوضہ)

''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے'' (افسانہ: معاوضہ)

''والدین کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے'' (افسانہ: مجھے ایک دن گھر جانا ہے)

''زندگی آمد برائے بندگی'' (افسانہ: کارِ خیر)

''لعل محمد کہ جنھوں نے بچپن ہی سے اپنے خاندان والوں کی بہترین تربیت میں رہ کر قرآن مجید، احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم، صحابہ کرام، بزرگانِ دین، اولیائے کرام اور صوفیوں سنتوں کی بصیرت افروز باتیں سیکھی تھیں، وہ اُن کے ذہن و دل پہ نقش ہو کے رہ گئی تھیں'' (افسانہ: ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی موضوع اور مواد کے اعتبار سے اپنے افسانوں کے کردار تخلیق کرتے ہیں اور کرداروں کے معیار و ماحول کے مطابق زبان کا استعمال کرتے ہیں۔

اُن کے بیشتر افسانوں کا اسلوب بیانیہ ہے۔ زبان و بیان کی سادگی، صفائی، برجستگی، مکالموں کی معنی خیزی اور موزونیت کے سبب اُن کے افسانے ترسیل وابلاغ کے مسائل اور الجھنوں سے پاک وصاف ہیں۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے روز مرّہ کی زندگی میں رونما ہونے والے ارد گرد کے حالات و مسائل سے متاثر ہو کر اپنے افسانوں میں حقیقتوں اور سفّاکیوں کے جو فکر انگیز مرقّعے پیش کیے ہیں وہ مشترکہ گنگا جمنی تہذیب و معاشرت، رواداری، یگانگت، مذہبی احکامات اور انسان دوستی کی طرف قارئین کو متوجہ بھی کرتے ہیں اور فرقہ واریت، مذہبی منافرت، مادہ پرستی، خود غرضی، تنگ نظری اور بدعنوانی جیسی لعنتوں کے خلاف احتجاج کی شایستہ لَے کو بلند بھی کرتے ہیں۔

....

ڈاکٹر حمید اللہ خان
پربھنی (مہاراشٹر)

افسانوی مجموعہ ''قبر میں زندہ آدمی'' کا فنی تجزیہ

مختصر افسانہ دوسری اصناف کے مقابلے ایک آزاد اور وسیع تر معنوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ مختلف دور میں مختلف اصناف نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں جاگیردارانہ نظام کی عیش کوشیوں نے داستان کو جنم دیا حقیقت پسند اظہاریت اور جاگیردارانہ نظام کے زوال نے ناول کو پروان چڑھایا، صنعتی اور سائنس وٹکنالوجی کی تیز رفتار زندگی نے افسانے کو وجود بخشا۔ کہا جاسکتا ہے اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے آبادی کا دھماکہ شہروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کھیت کھلیان اور گاؤں کی سوندھی مٹی کی بو باس سے بچھڑ کر شہروں میں آباد ہونے والے نوجوانوں کی بنتی بگڑتی زندگی اور اُس سے پیدا شدہ مسائل، عدم مساوات کا بڑھتا ہوا رجحان، مادّہ پرستی اور مفاد پرستی کے ساتھ ساتھ عالمی صارفیت کا بڑھتا ہوا اثر، عالمی مما لک کی آپسی رنجشیں اور اُن کے سائے میں تیل کا بڑھتا ہوا کھیل، اجڑتے ہوئے خوشحال مما لک جیسے پُر آشوب دور میں زندگی گذارتا ہوا انسان خود کو قبر میں زندہ آدمی ہی محسوس کر رہا۔

عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے جرائم طاقت ور مما لک کی انھیں سرپرستی اور دیگر مما لک میں پیر پسارتا ہوا دہشت گردی کا ماحول اُس کی تباہ کاریاں جنھوں نے دُنیا کو شہرِ خموشاں میں تبدیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ایسے ماحول میں انسان زندہ لاش بن کر رہ گیا ہے۔ مشتاق احمد وانی کا افسانوی مجموعہ ''قبر میں زندہ آدمی'' جو ۱۳ افسانوں پر مشتمل ہے مذکورہ حالات کے پس منظر میں زندہ آدمی کا استعارہ کہا جاسکتا ہے۔ اُسے زندگی، اُس کے

عوامل اورتہذیبی معاشرے کے زوال پذیر ہونے کا بیانیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ادب دراصل زندگی کا ترجمان اور مفسر کہلاتا ہے۔ دورِ حاضر کے پُر آشوب ماحول میں تخلیق کار سماج میں بکھرے پڑے بے شمار موضوعات کو اپنے مشاہدے تجربے اور محسوسات کے ذریعے قرطاس ابیض پر اتارتا ہے جس میں اُس کے نجی احساسات وجذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ واقعات کی ایک ایک کڑی ملا کر وہ زنجیر بناتا ہے اور اپنے قاری کے لئے پیش کر دیتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نے گرم صحرا میں بادِ صبا کی آمد کا اعلان کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں ایسا سچ جس پر جھوٹ کا، یا ایسا جھوٹ جس پر سچ کا گمان ہو افسانہ ہے چوں کہ افسانے میں سب کچھ سچ نہیں ہوتا یا سب کچھ جھوٹ نہیں بلکہ وہ جھوٹ اور سچ کا آمیزہ ہوتا ہے۔ افسانے میں زندگی کی رمق جذبہ خواہشیں تمنائیں خوشی وغم کے ملے جلے اثرات اور سماجی سیاسی ومعاشرتی مسائل بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار جن واقعات سے دوچار ہوتا ہے اُسے بیان کرنے میں کئی طرح کی من گھڑت باتوں کا ذکر بھی کرتا ہے اور کئی سچے واقعات کو اپنی تخلیق کا ذریعہ بناتا ہے۔ افسانہ چوں کہ دورِ حاضر کی سب سے مقبول ترین صنفِ نثر ہے اس کے اپنے کچھ فنی تقاضے ہیں کچھ اصول ہیں یا کچھ اجزائے ترکیبی ہیں جو وقت کے ساتھ مختلف پیرائے اظہار میں بیان ہوتے رہتے ہیں، ان ہی اصولوں پر افسانے کو جانچا اور پرکھا جاتا رہا ہے۔

اگر ہم مشتاق احمد وانی کے افسانوی مجموعہ ''قبر میں زندہ آدمی'' کا فنی تجزیہ کریں تو درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:-

پلاٹ:

قصہ واقعات کے مجموعہ سے تیار ہوتا ہے واقعات کی ترتیب یا تنظیم افسانے کے فن کو جلا بخشتی ہے۔ پلاٹ بنانا ایک قسم کا فن ہی ہے کیوں کہ پلاٹ میں قصہ نہایت سلیقہ کے ساتھ ڈھلتا ہے۔ پلاٹ کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسے سنگ تراش مخصوص فنی اصولوں کے

موافق پتھر کو تراش کر ایک خوش نما مورت تیار کرتا ہے۔ پلاٹ میں واقعات کی ترتیب و تنظیم مربوط ہوتی ہے۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں پلاٹ کی ترتیب و تنظیم پورے اعتماد کے ساتھ کی گئی ہے مجموعہ کا پہلا افسانہ ''مجھے ایک دن گھر جانا ہے'' میں جو واقعات کا تسلسل ملتا ہے وہ ایک دوسرے میں پیوست و مربوط ہے۔ اسی طرح 'انتظارِ مرگ'، 'حاضر جواب'، 'انتقام'، 'عورت'، 'معاوضہ'، 'کارِ خیر'، 'چار چہرے' اور 'قبر میں زندہ آدمی' مذکورہ تمام افسانوں میں واقعات ایک کے بعد ایک سامنے آتے ہیں اور افسانوی فضاء کو مزید بلندی عطا کرتے ہیں۔ واقعات کی فنی ترتیب کے لئے ماحول اور حالات کا بیان بھی افسانہ نویسی کے فن کو جلا بخشتا ہے۔ اس لحاظ سے مشتاق احمد وانی کی فنِ افسانہ نگاری پر پکڑ کافی مضبوط کہی جاسکتی ہے۔ ان کے افسانے کے پلاٹ سادے سیدھے اور قاری کو بغیر کسی الجھن میں یا سوچ وفکر میں ڈبوئے اختتام تک پہنچ جاتے ہیں اور قاری افسانے کے واقعات سے روبرو ہو کر تازگی و سکون محسوس کرتا ہے۔

موضوع:

افسانے میں موضوع کی بھی بنیادی اہمیت ہے کیونکہ موضوع اگر اچھوتا، نیا اور متاثر کرنے والا ہو تو افسانہ کامیاب اور یادگار رہتا ہے۔ اگر موضوع فرسودہ و پامال یا کمزور ہوگا تو افسانہ بھی کمزور ہوگا۔ افسانے کا موضوع ہماری حقیقی زندگی سے قریب ہونا چاہئے۔ دورِ حاضر میں انگنت موضوعات بکھرے پڑے ہیں جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ کئی واقعات، حادثات اور سانحات ہمارے اطراف وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ تخلیق کار اپنی حساس طبعیت اور فطرت کے مطابق جن واقعات سے متاثر ہوگا اُسی کو اپنا موضوع بناتا ہے اور انسانی خواہشوں، جذبوں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی نکتہ نظر بیان کرتا ہے۔ ویسے موضوع کے حوالے سے افسانہ نگار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ وہ

موضوعات کے انتخاب میں آزاد ہے وہ جس موضوع پہ چاہے افسانہ تخلیق کرسکتا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی لمحہ، جذبہ، احساس یا تجربہ افسانے کا موضوع بن سکتا ہے۔ افسانہ نگار کسی نہ کسی معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے اور اپنے معاشرے وسماج میں بے شمار موضوعات سے متاثر ہوکر افسانہ تخلیق کرتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی جتنی وسیع ہے اُتنی ہی وسعت افسانے کے موضوعات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اُس کا مقصد زندگی کی وسعتوں میں سمٹی ہوئی تمام موجودات کی تشریح، تجزیہ، توجیہ تو تعلیل پیش کرنا ہے۔ افسانہ نگار ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے کے مشاہدات تجربات اور پیشن گوئی کے حوالے سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تصویر کشی کرسکتا ہے۔ موضوع دراصل افسانے کی روح ہے جو دیگر افسانوی فن کے اجزاء میں بے چین و بے قرار رہتے ہوئے انھیں متاثر کرتی ہے۔

مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانوی مجموعہ میں افسانے کے جو موضوعات اٹھائے ہیں وہ اسی معاشرے اور سماج کے ہیں۔ ہمارا معاشرہ جن مسائل سے دوچار ہے اور جو واقعات موجودہ دور کے سماج میں وقوع پذیر ہورہے ہیں انہی کو موضوع بنایا ہے۔ آج کے معاشرے میں مشترکہ خاندان کی روایتیں مسدود ہوتی جارہی ہیں۔ روزی روٹی کی تلاش میں لوگ شہروں کی سمت چلے آرہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دیہی علاقوں میں تعلیمی وسائل کی کمی نے نوجوانوں کو شہروں کی سمت دوڑنے پر مجبور کردیا ہے اور اس سے مزید نئے مسائل سر ابھار رہے ہیں خاص طور سے نئی نسل اپنی جڑوں سے کٹ کر خودغرضی اور مادّہ پرستی کا شکار ہوتی جارہی ہے اور نئی تہذیب سے جڑنے پر پرانی قدروں کی یادیں انھیں بے چین اور اضطرابی کیفیت میں زندگی گذارنے پر مجبور کررہی ہیں۔ اسی طرح کے موضوعات مذکورہ افسانوی مجموعہ میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ''مجھے ایک دن گھر جانا ہے'' کا موضوع اعلیٰ تعلیم کا اصول اور بہتر مستقبل کی تلاش میں شہروں کی سمت روانگی، نوجوانوں کا جذباتی استحصال کیا جانا ہے۔

'انتظارِ مرگ' افسانہ کا موضوع نئی نسل میں سماجی و مذہبی اقدار کی کمی کا رجحان ہے۔ نئی نسل دراصل بزرگوں کے احترام اور تقدس سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے۔ ٹی وی کی چاہت کا بڑھتا ہوا رجحان اور اُس کے منفی اثرات معاشرے میں نئے مسائل پیدا کررہے ہیں۔ ماں باپ کی بچوں کے تئیں ذمہ دارانہ فرائض سے دوری بھی بزرگوں کے احترام سے گریز کا ذریعہ بن رہی ہے اس لئے بوڑھے ماں باپ بوجھ تصور کئے جارہے ہیں اور انھیں اپنی خواہشوں کی تکمیل میں روکاوٹ سمجھ کر بزرگوں کی موت کی دُعا مانگنے والی اولاد کا روپ سامنے آرہا ہے یعنی سماج اور مذہبی اقدار کی پامالی اس افسانے کا موضوع ہے۔

''واپسی'' افسانے کا موضوع بھی طبقاتی زندگی، ذات پات اور بھید بھاؤ مسلکوں میں بٹا ہوا معاشرہ کہا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے سماجی یگانگت بھائی چارہ اپنائیت جیسی اعلیٰ اقدار کہیں گم ہوتے دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ صرف سماجی سطح پر ہی نہیں ہے بلکہ اس کو سیاسی حربہ کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ آج کے دور میں ایک بڑے سیاسی لیڈر کا بیان ہے کہ ہم نے شعیہ اور سُنی مسلمانوں کو بانٹ دیا ہے اور ہندوؤں کو ایک کردیا۔ اس طرح کے بیانات بھی سماج میں منافقت پھیلانے کے ذمہ دار ہیں اس لحاظ سے ملک پر برسرِ اقتدار لوگ بھی مسلکوں اور ذات پات کو بڑھاوا دینے میں لگے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لحاظ سے یہ موضوع بہت اہم کہا جاسکتا ہے جسے مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانے میں تخلیق کرکے سماج کو اُس کا آئینہ دکھایا ہے۔

''حاضر جواب'' افسانہ دراصل تعلیمی نظام کی کمیوں پر مشتمل ہے اس کا موضوع تعلیمی نظام پر سوالیہ نشان لگاتا ہے کہ تعلیم جو کہ آدمی کو انسان بننے میں مدد کرتی ہے ٹیچر یا اساتذہ کا درجہ انتہائی تقدس اور احترام کا ہوتا ہے۔ نئی نسل کی آبیاری اُن میں عقل وشعور کے ساتھ ساتھ ذمہ دار شہری اور صالح معاشرہ کا فرد بننے کی صلاحیت کو پروان چڑھانا ہوتا ہے لیکن تعلیمی نظام میں اساتذہ اپنے فرائض سے کوتاہی برت رہے ہیں بلکہ تعلیمی ادارے

تاجرانہ ذہنیت کے ہوتے جارہے ہیں۔کاروباری لوگ تعلیمی اداروں کے سربراہ بن گئے اس لئے نااہل اور غیر معیاری تعلیم یافتہ لوگ اساتذہ بنتے جارہے ہیں چاپلوسی اور مصالحت پسندی سے،موقع محل کے اعتبار سے اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کرنے کا ہنر اور مثالی اساتذہ کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا گُر سیکھ لیا ہے اس لئے صالح کردار کے مثالی شہری،لیڈر یہاں تک کے ماں باپ بھی سامنے نہیں آرہے ہیں۔اس سچائی کو مشتاق احمد وانی نے ''حاضر جواب'' افسانے کے پس منظر میں موضوع بنا کر سماج کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی ہے۔

اپنی ناکامی اور بے عزتی کا بدلہ لینا انسانی فطرت میں شامل ہے کوئی غیر ذمہ دارانہ کام کرنے پر پکڑے گئے تو لوگ اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں اور موقع محل کے اعتبار سے اُس کا بدلہ یا انتقام لینے کی تگ ودو میں رہتے ہیں خاص طور پر نسوانی نفسیات اور جبلتیں اس میں سرِ فہرست کہی جاسکتی ہیں۔''انتقام'' افسانے کا موضوع چوری اور سینہ زوری ہے پڑوسن اپنی پڑوس کی مرغی کو پکڑ لیتی ہے اور مرغی کی مالکن جب اپنی مرغی مانگتی ہے یا چھین لے جاتی ہے تو مرغی کو مالِ غنیمت سمجھ کر قید کرنے والی پڑوسن انتقام کی آگ میں جلتی ہے اور موقع پا کر اسقاطِ حمل کے جرم میں پڑوسی کو جیل بھیج دیتی ہے۔اس طرح کی منفی سوچ معاشرے کو کس سمت میں لے جارہی ہے؟ یہ سوالیہ نشان بھی ابھرتا ہے۔اس لحاظ سے افسانہ انتقام سماج میں پھیلتی خودغرضی کو بے نقاب کرتا ہے۔

سماج میں عورتوں کا مقام ومرتبہ انتہائی بلند ہے۔رشتوں کا تقدس اور اس کی اہمیت وافادیت کے لحاظ سے عورت کے کئی روپ ہیں ماں کے روپ میں وہ تقدس کی انتہائی بلندیوں پر ہے جس کے پیروں تلے جنت کہی جاتی ہے بہن کے روپ میں محبت اور اپنائیت کی مورت ہے۔ بیوی کے روپ میں وفا شعار خاتون بیٹی کے روپ میں ممتا کی لاڈلی اور محبوبہ کے روپ میں الفت کی دیوی تک تصور کی جاتی ہے لیکن یہ تمام روپ صرف کتابی اور تصوراتی دُنیا میں اچھے لگتے ہیں۔مرد ہمیشہ ہی عورت کے رشتوں کا استحصال کرتا

آرہا ہے۔آج کا نوجوان عورتوں کوصرف ایک صنفِ نازک سمجھتا ہےاور رشتوں کے تقدس کو پامال کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتا''عورت''اس افسانے کا موضوع اوچھی حرکتیں اور چھیڑ چھاڑ ہے جوآج کا سلگتا ہوا مسئلہ بھی ہے،عورتیں ایسی چھیڑ چھاڑ سے پریشان ہیں اور اُن میں مردوں کے تئیں نفرت کا جذبہ پروان چڑھنا لازمی ہے۔اخلاقی فقدان اور خواتین کی ہوتی ہوئی بے حرمتی سماج میں افراتفری پھیلانے کا ذریعہ بن رہی ہے۔اسی کوافسانے کا موضوع بنا کراس کے گردافسانے کا فنی تانابانا بُنا گیا ہے۔

اسی طرح مشتاق احمد وانی کے دیگرافسانوں میں پردہ کی اہمیت وافادیت،لال فیتہ شاہی کا دفتروں میں بڑھتا ہوا رجحان، رشوت خوری کا ماحول،جسم فروشی، صالح معاشرے کے لئے جدوجہداور سب سے بڑھکر ہندوستان کا موجودہ مسئلہ نوٹ بندی اور اُس کے اثرات کوموضوع بنا کرافسانے تخلیق کئے گئے ہیں جوحقیقت نگاری کی مثال کہے جاسکتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانوں میں موجودہ دور کے معاشرے کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے موضوع بنا کراپنے قاری کوسوچنے پر مجبور کردیا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ان افسانوں کے مطالعہ سے ایک تاثر ابھرتا ہے کہ ہم ترقی پسند معاشرے کے پروردہ ہیں اوراپنے معاشرے میں سارے مسائل ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں اپنے اخلاق،کرداراورخودکی سوچ واعمال بدلنے کی ضرورت ہےتب ہی ہم ایک صالح معاشرے کی تشکیل میں معاون ومددگارثابت ہوسکتے ہیں۔

کردار:

واقعات کی صحیح تنظیم وتسلسل کا دارومداراُن افراد پر ہوتا ہے جواُن واقعات کو آگے بڑھاتے ہیں ان ہی افراد کے اعمال ذہنی کیفیت حرکات وسکنات دوسروں سے حُسنِ سلوک یارنجش حسد،جلن،خوشی اوراپنائیت کے جذبہ پر ہوتا ہے جوقصہ کے لئے معاون و

مددگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔قصہ کی کامیابی کا دارومدار کچھ کرداروں کی صحیح تخلیق پر ہوتا ہے اور قصہ کو دلچسپ بنانے میں کرداروں کا اہم رول بھی ہوتا ہے کیونکہ ان کرداروں میں دراصل انسانی زندگی کی فطری جبلتیں اور نفسیاتی گرہ کھلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

واقعات، حادثات کے دوران کردار اپنے پورے وجود کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور عمل ورد عمل کے طور پر اپنا اپنا رنگ بھی دکھاتے ہیں کردار صالح معاشرے کے امین بھی ہوتے ہیں اور منفی رجحانات کے ذریعے معاشرے کی بدصورت، بھدی اور گھناونی تصویریں بھی پیش کرتے ہیں۔اس لئے افسانوں میں کردار کی اہمیت مسلّم ہے۔مشتاق احمد وانی کے افسانوی کردار متوسط طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کرداروں کی خواہشیں، تمنائیں، جذبے، احساسات، اپنائیت اور بھائی چارے کی غماز ہیں ان کرداروں میں محسن میاں، غلام دین، دیا رام، رمیش بھاردواج، مفتی، پکارناتھ جیسے عام انسانوں کی نمائندگی کرنے والے کردار ہیں جو دورِ حاضر کے مختلف مسائل سے دوچار ہیں سب اُن مسائل کا مداوا چاہتے ہیں۔ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تہذیب اور معاشرتی، مذہبی اقدار کی پاسداری و پاسبانی متوسط طبقہ کے حصہ میں آئی ہے کیونکہ یہ طبقہ تمام تہذیبی اقدار کو سمجھنے اور اُس کو جتن کرنے میں غیر محسوس طریقہ سے وابستہ رہتا ہے۔غیرت، حمیت، عزت و ناموس کو بنائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے جب کہ مالدار طبقہ یا سب سے کمزور طبقہ مذکورہ باتوں سے دور رہتا ہے۔سماج کی تمام برائیاں اور قانونی بالا دستی سے بالاتر اگر کوئی طبقہ ہے تو وہ مالدار طبقہ اور کمزور طبقہ ہے کیونکہ ایک اقتدار کے اور پیسے کے نشے میں اپنے سارے منفی رویے، اور کارنامے اور بُرا برتاؤ انجام دیتا رہتا ہے اور انھیں مٹانے کے لئے بے دریغ پیسہ خرچ کرتا ہے۔کمزور طبقہ کے پاس پیسہ نہیں اُسے قانونی چارہ جوئی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔غیر قانونی کاموں میں وہ ملوث رہتا ہے لیکن متوسط طبقہ ذرا ذرا سی غلطی پر شرمندگی محسوس کرتا ہے۔اُسے ڈر رہتا ہے کہ سماج کیا کہے گا ہماری عزت پر دھبہ لگ جائے

گا اس لئے تہذیبی اقدار کا پاسبان یہی متوسط طبقہ کہا جا سکتا ہے۔اس لحاظ سے مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانوں کے کردار متوسط طبقہ سے منتخب کئے ہیں اور اُن کے افعال واعمال کے ذریعے سماج کی تصویر کشی کی ہے ان افسانوں کے کردار متحرک اور جاندار کہے جا سکتے ہیں جو سیدھی سادی زندگی گذارتے ہیں اور خوش رہتے ہیں اپنی خوشی کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کرداروں میں اپنی وراثت، سچائی اور تہذیبی پاسداری و سماجی اقدار کو بچانے اور انھیں نبھانے کی تڑپ محسوس کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح نسوانی کرداروں میں رفعت، نیلم کماری، نور جہاں، مہر افروز، پڑوسی، رام دُلاری وغیرہ کے ذریعے افسانہ نگار نے سماج کی نصف آبادی کی نمائندگی کو جگہ دی ہے۔نسائی جذبات خواہشات اور اُن میں پلنے والی سماجی ذمہ داری کو پورا کرنے کا احساس جیسے مثبت رویے محسوس کئے جا سکتے ہیں تو وہیں بدلہ، حسد، جلن، کینہ کپٹ جیسے منفی جذبوں کو بھی ان کرداروں کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے جو بعض نسوانی کرداروں میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مشتاق احمد وانی کے کرداروں کی تخلیق میں نسوانی خواہشیں، آرزوئیں، تمنائیں بیان کی گئی ہیں اُن کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات پر کافی مضبوط گرفت نظر آتی ہے۔

مکالمے:

افسانوی ادب میں مکالموں کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔اسی کے ذریعے کردار کی خصوصیت اور اس کے محسوسات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ مکالموں کے صحیح اور برمحل استعمال پر حقیقی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ مکالمہ جتنا چست، برجستہ، فطری اور مختصر ہوگا اتنا ہی افسانے کی دلکشی میں اضافہ ہوگا اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کر پائے گا۔ مکالمے کو واقعات میں اس طرح رچ بس جانا چاہیے کہ اُس کا وہاں سے ہٹانا ایک بارِ محال ہو۔

کہا جا سکتا ہے کہ مشتاق احمد وانی نے مکالمہ نگاری کے لئے سیدھے سادے جملے

اس انداز میں تخلیق کئے ہیں جو عام انسان کے عام خیالات پر مبنی ہیں فصیح اور بلیغ تصنع اور مقفی و مسجع مکالمے نہیں بلکہ سلیس اور سادہ الفاظ کے ذریعے مکالمے کو عام فہم بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے جس کی وجہ سے افسانے بوجھل نہیں محسوس ہوتے۔ کرداروں کی نوعیت سماجی درجہ اور اُس کی اپنی سمجھ کے لحاظ سے مکالمے بیان کئے گئے ہیں۔ بے جا طویل مکالمے سے گریز کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری اپنے قاری کے دل میں جگہ بناتی ہے۔

منظر نگاری:

منظر نگاری فن افسانہ نگاری کا ایک اہم جز کہا جاتا ہے جس سے افسانے کی تخلیق میں جان پڑ جاتی ہے۔ افسانہ نگار جس چیز کو منظر بنا کر پیش کرے گا اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے گی۔ بعض اوقات مقام و محل موسم اور مکان و آبادی کے نقشہ ناچ رنگ میلے، ٹھیلے، جلسہ جلوس یا شہری ماحول کے مرقعے بیان کرتے وقت منظر نگاری آسانی سے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں دیہی زندگی اور اُس سے متعلق منظر دکھائی دیتے ہیں۔ اُن میں مکان کی بالائی سطح سے نظر آنے والا منظر، اپنے وطن مالوف کا جغرافیہ یاد کرنا، شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جانے کا بعد کا منظر، شادی بیاہ کی رسمیں اُن کا ذکر وغیرہ مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ وہ مزید منظر نگاری کا استعمال کر سکتے تھے لیکن افسانے کی تعمیر و تشکیل نے شاید انھیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

اسلوب:

ہر فن کار کا اسلوب مختلف ہوتا ہے اسلوب کی مثال جسم کے لباس کی مانند کہی جا سکتی ہے، اگر آپ کتنے ہی خوبصورت وجیہ نوجوان کیوں نہ ہوں اگر آپ نے سلیقہ کا لباس زیب تن نہ کیا ہو تو آپ کی شخصیت نکھر کر سامنے نہیں آتی۔ اسی طرح افسانے کا موضوع کتنا ہی اچھوتا اور خوبصورت کیوں نہ ہو لیکن اُسے اگر مناسب ادبی معیار کے

اسلوب میں بیان نہ کیا جائے تو اُس میں تاثر پیدا ہونا ممکن نہیں۔ افسانہ نگار کے اسلوب میں سوز وگداز، اشاریت، رمزیت، معنی والفاظ کے مختلف رنگ ہونا بھی لازمی ہے۔ اسلوب کی کئی قسمیں ہیں اُن سے قطع نظر اگر مشتاق احمد وانی کے افسانوی مجموعہ 'قبر میں زندہ آدمی' کے افسانوں کے اسلوب پر غور کیا جائے تو ہمیں بیانیہ اسلوب کا اندازہ ہو جائے گا۔ اُردو افسانہ نگاری میں بیانیہ اسلوب عام ہے، اس اسلوب میں افسانہ نگار نے غیر جانبداری سے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے اسے ہم کہانی کہنے کا آسان طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے کھل کر بیانیہ اسلوب استعمال کیا ہے اور راوی کی حیثیت سے افسانہ نگار اپنے وجود کا احساس بھی دلاتا رہا ہے۔ اُن کے افسانوں میں بوجھل فضاء یا گنجلک خیالات، غیر ضروری مکالموں کا گمان تک نہیں ہوتا قاری افسانے میں دلچسپی لیتا ہے اور ایک ایک واقعہ اُس کے ذہن میں اترتا چلا جاتا ہے۔ یہی بیانیہ کی خوبی بھی ہے جسے افسانہ نگار نے ایمانداری سے بیان کیا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ مشتاق احمد وانی نے اس افسانوی مجموعہ کے افسانوں میں بلحاظ موضوع پلاٹ کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور اسلوب بیان کو پورے اعتماد کے ساتھ برتا ہے۔ اُن کی افسانہ نگاری فنِ افسانہ کی مختلف اصولوں یا اجزائے نگاری کے جلو میں پروان چڑھی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ اپنے قاری تک اپنی سوچ فکر و پیغام کو پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

....

احمد رشید (علیگ)
09897411153

حقیقت کو کہانی بنانے کا فن کوئی مشتاق احمد وانی سے سیکھے

زندگی اور موت کی سنگینیوں اور کائناتی سچائیوں کو کہانی کے انداز میں اس طرح پرو دینا کہ فنتا سی حقیقت اور حقیقت فنتاسی لگنے لگے، ورنہ حقیقتوں کو پیش کرنے کے لیے علم وحکمت کی مختلف شاخیں اور ادب کی دیگر اصناف سخن موجود ہیں۔ افسانہ شعور وادراک کی پُر اسرار کائنات کو دریافت کے بعد تخلیقی جمال کے ساتھ پیش کرنے کی سعی ہے۔

کہانی انسان کی سرشت میں اس طرح داخل ہے کہ انسان عہد طفلی سے پیران سال اور اس سے آگے دامن کش نہیں ہو سکتا، جس طرح غزل اردو زبان وادب کی تہذیب ہے اسی طرح کہانی انسانی تہذیب کا جز ہے۔ اسی لیے حیات تا موت انسان کی دلچسپی اس سے قائم رہتی ہے۔ کہانی کہنے سننے کے عمل میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انسان کی کہانی انسان کے ذریعے انسان کو سنانے کا یہ طریقہ روز ازل سے آج تک جاری وساری ہے۔ پیش نظر کائنات کیسے بنی؟ کیونکر بنی؟ کس کے لیے تخلیق ہوئی؟ نظام کائنات کو چلانے والا کون ہے؟ بظاہر نظام زندگی انسان کس طرح چلائے؟ افزونی حیات کے لیے کیا اپنائے اور کیا چھوڑے؟ ایسے سوالات ہیں جن کو حل کرنے کے لیے فرد روز ازل سے امروز تک اور فکر فردا میں روز وشب مصروف ہے، مگر صفر ہاتھ لگتا ہے اور پھر نئے سرے سے غور وفکر کرتا ہے۔ حیات وممات اور عالم ارضی وعالم سموی کے مسائل کے سد باب میں کوشاں ہو جاتا ہے۔ کہانی ہونے کا عمل زیریں لہروں کی طرح اسی رنگ میں چلتا رہتا ہے اور کہانی کہنے والا

اسی رنگ کو اپنا آہنگ دے کر پیش نظر کائنات کے متوازی ایک نئی کائنات تخلیق کرتا ہے جو حقیقی ہوتے ہوئے بھی تخیلی ہوتی ہے اسی لیے بیدی کہتے ہیں کہ افسانہ حقیقت اور تخیل کی آمیزش سے بنتا ہے۔ افسانہ نہ تو نرا سچ ہوتا ہے اور نہ ہی جھوٹ بلکہ جذب و کیف میں ڈوبی ہوئی ایک سچائی ہوتی ہے یعنی زندگی کے سچ کی Remaking ہوتی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں فرد حقائق پسندی کے زعم میں کہانی ہونے یا کرنے سے انکار کرے، لیکن موت و زندگی کے واقعات یا ناگہانی حادثات اور پُر اسرار سانحات جو اس کائنات میں رونما ہوتے ہیں اس کا اقرار کرنے کے لیے وہ مجبور بھی ہے اور معذور بھی:

''میں جیتے جی قبر میں پہنچ گیا تھا۔ اوپر والے کی مہر کہ زندہ ہوں، دنیا والو! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کب اوپر والے کا بلاوا آئے۔ اس لیے سنبھل جاو۔ اچھے بُرے کا خیال رکھو'' (افسانہ ''قبر میں زندہ آدمی'')

رقت آمیز لہجہ میں یہ بیان یار خان لوگوں کے ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے اس وقت کہتا ہے کہ ایک نئی طرز کے بیت الخلا میں رفع حاجت سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس میں بند ہو جاتا ہے اور باوجود بہت کوششوں کے باہر نہیں نکل پاتا ہے۔ آخر میں حسینہ بیگم کی مدد سے دروازہ توڑ کر وہ باہر نکل پاتا ہے۔ اس دوران وہ اپنے آپ کو قبر میں زندہ آدمی کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ دراصل مشتاق احمد وانی کے افسانوی مجموعہ کی کہانی ''قبر میں زندہ آدمی'' کا بنیادی کردار یار خان نئے زمانہ کا صاحب ثروت اے کلاس ٹھیکیدار ہے۔ دولت کی فراوانی ہے۔ بقول مصنف:

''اس قدر رنگین مزاج تھے کہ دنیا کو دارالعمل کے بجائے دارالتفریح سمجھتے تھے''

ایمان کی کمزوری کے سبب شراب جس کو اسلام میں ام الخبائث کہا جاتا ہے کے شوقین تھے۔ عمر ۶۰ سال، چار بچوں اور نوکر وچاکر پر مشتمل ایک خاندان خوشگوار اور خوش

وخرم زندگی گزار رہے تھے۔ رجنی نام کی لڑکی پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس کو گھر میں لانے کے لیے حسینہ بیگم جوان کی شریک حیات ہے کے کام میں ہاتھ بٹانے کے بہانے بیاہ کر لانے کے لیے طوعاً وکرہاً راضی کر لیتے ہیں۔ بیت الخلا کے واقعہ کا ان کے دل ودماغ پر ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے رجنی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور یار خان اپنی بیوی حسینہ بیگم کے ساتھ بقیہ زندگی اپنی عاقبت سدھارنے میں لگ جاتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی مذہبی فکر اور اسلامی تعلیمات کو اپنی کہانیوں میں ابھارنے میں کہیں نہیں چوکتے۔ قرات کے وقت کہانیوں میں مصلحانہ کوشش اور واعظانہ تصور کرداروں کی حرکات وسکنات اور نطق وزبان سے ظاہر ہونا مصنف کی مذہب پرستی کی دلیل ہے۔ مابعد جدید ناقدین مذہبی فکر کو اسلامی تہذیب کا اہم عنصر خیال کرتے ہیں۔ مسلہ پیش کرنے کا ہے کہ تخلیقی سطح پر اسے کیسے کہانی کی بافت میں گوندھا جائے۔ یہ مصنف کے فنی برتاو کا معاملہ ہے، جس کا رشتہ اس کے تخلیقی شعور سے جڑا ہوتا ہے:

''میں رات کو تہجد پڑھتی ہوں۔ تمہارے اس نرم گرم بستر پہ جب لیٹوں گی تو میں کہاں جاگ پاوں گی۔ قبر میں یہ نرم گرم بستر تو نہیں ہوگا'' (افسانہ ''سب کی ماں'')

''دھرم چند...... یار...... میرے پاس توحید ورسالت کی عظمت وفضیلت، پانچ وقت کی نمازوں کی ٹھنڈک، رمضان المبارک کے تیس روزوں کا تقویٰ، عشر وذاکوۃ کی اہمیت وافادیت اور حج وعمرہ کی تمنا تھی۔ چنانچہ دو متضاد طبعیتوں کے تصادم میں بُری طرح مجھ سے میرا حق چھینا گیا'' (افسانہ ''معاوضہ'')

''اماں! اللہ نے دنیا کے ہر لڑکے اور لڑکی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی، لڑکے سے شادی کریں۔ اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے''

(افسانہ ''مجھے ایک دن گھر جانا ہے'')

اسی طرح کہانی '' کار خیر'' انتظار مرگ'' قبر میں زندہ آدمی'' انتقام'' وغیرہ مذہبی

فکر سے لبریز ہیں جو انسانیت کا درس دیتی ہیں اور عوام وخواص کو اصلاحی پیغام سناتی ہیں کہ وہ انسانیت کی فلاح و بہبود اور کردار و اخلاق کی تعمیر وتشکیل کا خواہش مند ہے۔ مصنف نے فنی لوازمات کی کسوٹی پر مقصدیت کو فوت نہیں ہونے دیا ہے۔ افسانے کی عنصری باریکیوں کو سرسری طور سے گزرتے ہوئے کہانی کہنے پر توجہ دی ہے اور موضوعی سطح پر نگاہ کو مرکوز رکھتے ہوئے واقعہ نگاری میں اصلاحی پہلوؤں کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی کہانیوں میں اصلاحی پہلو اس طرح حاوی ہیں جیسے سطح آب پر روغنی بوندیں جھملا رہی ہوں۔ ان کی کہانیوں میں ہمیں مقصدیت کی افادیت کہانی کو افسانہ بنانے کی بافت سے زیادہ اہمیت کی حامل معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کا بیانیہ سہل اور رواں ہے کہ کہانی کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں اور قاری کو کسی ذہنی کسرت سے نہیں گزرنا پڑتا۔ بہر حال کہانی پڑھنے کے بعد اثر انداز ہونے لگے، اس فن سے مصنف اچھی طرح واقف ہے۔ انھوں نے پلاٹ کی تعمیر وتشکیل میں وحدت وندرت پیدا کرنے کے بجائے سیدھے سادے انداز میں کہانیوں کو بیان کیا ہے۔ صنفی بنیادوں سے قطع نظر اگر موضوعی نقطۂ نظر سے مشتاق احمد وانی کی کہانیوں پر غور وفکر کریں تو ان کے یہاں زیادہ تر سبق آموز اور عبرت آمیز موضوعات ملیں گے جن کا ایک مذہبی پس منظر ہوتا ہے۔

کہانی ''چار چہرے'' موجودہ سیاسی صورتحال پر طمانچہ ہے۔ برسر اقتدار پارٹی کی حکومت کے پیدا کردہ مسائل سے عوام کو سخت ترین حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ کمر توڑ مہنگائی، نوٹ بندی، جی ایس ٹی نافذ ہونے سے پورا ملک خصوصی طور سے غریب عوام کا جینا مشکل ہو گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جمہوری راستے سے حکومت اقتدار میں آئی ہے اور جمہوری نظام کا گلا کاٹ رہی ہے۔ گنگا جمنی تہذیب میں زہریلا مادہ گھول کر سیاسی اور سماجی ماحول کو گندہ کر دیا گیا ہے۔ صفائی ابھیان کا ذکر بھی اس کہانی میں موجود ہے۔ بینک میں پرانے نوٹ بدلنے کی غرض سے ایک غریب بُڑھیا جاتی ہے۔ بھیڑ کی زیادتی، گرمی کی

شدت اور بڑھاپے میں سخت تکلیف اٹھانے کے سبب اس کی آتما پرماتما کے پاس پہنچ گئی:

''ایک آدمی اسے پانی پلانے کے لیے دوڑا۔ وہ جونہی پانی کا گلاس لے کر بڑھیا کے قریب پہنچا تو اتنے میں اس کی آتما، پرماتما کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پاس بُک اور پانچ سو روپے کے نوٹ کے ساتھ مٹھیوں کی صورت میں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے'' (افسانہ ''چار چہرے'')

ملک میں پھیلی رشوت کو کہانی ''ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی'' میں موضوع بنایا گیا ہے۔ اس بدعنوان نظام میں نوکرشاہی سے لے کر کرسی پر براجمان نیتا لوگ بھی ملوّث ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار لعل محمد اپنا جی پی فنڈ جلدی نکلوانے کی غرض سے سفارش کے لیے میونسپل کمیٹی کے صدر دھیان سنگھ کے پاس جاتا ہے تو اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو کر اپنے آپ سے کہتا ہے:

''اس جمہوری دور میں بھی راجپوتانہ شان و شوکت برقرار ہے''

کہانی کا عنوان چونکانے والا ہے۔ اس کی وضاحت ایک ضمنی کردار محلے کا نیتا دھیان سنگھ اس طرح کرتا ہے:

''بہتر تو یہ تھا کہ آپ پیتل کا ڈنڈا ہر وقت اپنے پاس رکھتے، لیکن چونکہ آپ ابھی نئے ہیں اس لیے لکڑی کا ڈندا ہی چلے گا'' (افسانہ ''ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی'')

آگے وہ گالیوں کی ایک نئی پری بھاشا اس طرح کرتا ہے:

''لعل محمد صاحب، سفید گالیاں اشاروں، کنایوں، تشبیہوں، علامتوں، استعاروں، طنز و رمز کی میں دی جاتی ہیں۔ جب کہ کالے رنگ کی گالیاں سیدھی چہرے پہ دی جاتی ہیں جو چھاتی اور پشت کو چیرتی ہوئی باہر نکل جاتی ہیں'' (افسانہ ''ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی'')

دراصل لعل محمد محکمہ باغبانی میں تیسرے درجہ کا ملازم ہے۔ محکمہ کی خدمت گزاری میں اپنی عمر کے قیمتی بیس سال دے چکا ہے۔ ابھی ریٹائرڈ ہونے میں دس سال باقی ہیں اپنی

بیٹی کی شادی کے موقع پر جی پی فنڈ نکلوانے کے لیے درخواست دیتا ہے، لیکن آفس کلرکوں کی ٹال مٹول سے فائل ادھر ادھر گھومتی رہتی ہے۔ اپنا ہی پیسہ نکلوانے کے لیے دس ہزار روپیہ اور ایک بوتل وہسکی کا مطالبہ ہے۔ آفس کے چکر لگاتے لگاتے جسمانی اور ذہنی اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کا براہ راست اظہار کہانی میں ہوا ہے۔

''واپسی'' میں سماجی نابرابری کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دلت ساہتیہ، ادب میں ایک ڈسکورس کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندو سماج میں چھوا چھوت، اونچ نیچ اور غیر برابری کا تصور ہندو دھرم کی آتما ہے۔ ہزاروں سال سے پورا ہندو سماج چار ذاتوں میں تقسیم ہے۔ انسانی سماج میں چھوٹے بڑے کی یہ تقسیم غیر انسانی عمل ہے، لیکن کیا کیا جائے۔ اس بے ہودہ روایت نے مذہبی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اتنا آسان بھی نہیں۔ آج بھی صورتحال جوں کی توں ہے۔ دانشور طبقہ نے اپنے اپنے طور سے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کو مٹانے کے لیے مختلف طریقے اپنائے۔ بابا صاحب امبیڈکر نے اس منوادی سماج کے خلاف سیاسی اور سماجی پلیٹ فارم سے آواز اٹھائی۔ خود گاندھی جی دلتوں کے ساتھ چھوا چھوت کے برتاؤ کو ناپسند کرتے تھے اور اپنی ٹھوس دلیلوں کی بنیاد پر اپنے نظریہ کی وکالت کرتے نہیں تھکتے تھے، لیکن مذہبی روح کے سامنے ہر سائنٹیفک دلیل بے معنی تھی۔ آج اس سائنسی دور میں بھی اونچی ذات کا طبقہ چھوٹی ذات کے لوگوں کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کو وہ عزت و وقعت نہیں ملتی۔ انسان ہونے کے ناطے جس کے وہ مستحق ہیں۔ آزاد ہندوستان میں روزمرہ کے واقعات سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں کہ اعلیٰ ذات نے دلت سماج کے ساتھ کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں۔ یہ قدیم تاریخ کا حصہ ہی نہیں بلکہ جدید دور میں بھی ان کو سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور معاشی اعتبار سے حاشیہ پر رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سماجی تقسیم اس قدر Powerful ہے کہ اس کے اثرات ہندوستانی مسلم سماج پر بھی نظر آتے ہیں، جب کہ اسلام اونچ نیچ اور رنگ و نسل کے خلاف ہے بلکہ مسلکی فرق نے

بھی شدت اختیار کر لی ہے:

''ارے آپ تو اسلام قبول کرنے آئے تھے، کس سوچ میں پڑ گئے؟ فوراً واپس چل پڑے''

دیارام نے جواب دیا

''مفتی صاحب! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ میں کون سا مسلمان بنوں۔ سنّی بنوں، شیعہ بنوں، مالکی بنوں، حنبلی بنوں، شافعی بنوں، غیر مقلد بنوں، دیو بندی بنوں یا بریلوی؟''

کہانی لکھنے میں مشتاق احمد وانی کی نظر کہانی کہنے اور خصوصی طور پر موضوع پر ٹکی رہتی ہے جو ساختیاتی نظام کے اندرونی سطح پر اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ قاری کو اس کی جستجو کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ یہی سبب ہے ان کے یہاں نہ کوئی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی ابہام۔ سیدھی سادی زبان میں انھیں کہانی بیان کرنے کا فن آتا ہے۔ ایک مختصر کہانی ''حاضر جواب'' کا مرکزی کردار پکارناتھ کے اردگرد کہانی گھومتی ہے۔ ایک ہائر اسکینڈری اسکول میں علم حیاتیات (Zoology) کا استاد ہے۔ بہت زیادہ لالچی اور مطلب پرست انسان ہے۔ پڑھانے لکھانے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ گھر میں ٹیوشن پڑھانے کا وہ عادی ہے۔ فرائض منصبی سے وہ غافل ہے۔ بقول مصنف:

''اسکول کے اندر اور باہر لوگ انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ کھانے پینے والے آدمی ہیں۔ انھیں معمار قوم کے بجائے اگر مسمار قوم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا'' (افسانہ ''حاضر جواب'')

اس کے باوجود مکّاری اور حاضر دماغی کی وجہ سے اس کی فائل محکمہ تعلیم کے اعلیٰ آفیسر کے حکم سے پرنسپل کو بیسٹ ٹیچر ایوارڈ کی منظوری کے لیے آفس بھیجنی پڑتی ہے۔ اس دور کی یہ بدنصیبی ہے کہ ایسا کل جُگ آئے گا ہنس چُگے گا دانہ دُنکا کوا موتی کھائے گا۔

کہانی ''سب کی ماں'' کرداروں کی کہانی ہے۔ بہاراں عمر کی بیاسی بہاریں دیکھ

چکی ہے۔ اس عمر میں حواس، عوارض سب ہی شل ہو جاتے ہیں۔ ضعیف ہونے کے باوجود طبعیت میں طمطراق ہے۔ صحت بھی چست درست ہے۔ لاٹھی کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو عادتاً لاٹھی لے کر اس لیے چلتی تھی کہ راستے میں کوئی بندر، کُتا، بھیڑیا وغیرہ حملہ آور نہ ہو جائے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ دایا تھی۔ اس لیے اکثر رات میں زچگی کے لیے بُلاوا رہتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ یہ مشترکہ نسل اسی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مشترکہ نسل اس کے ہاتھوں سے شکم مادر سے اس جہان رنگ و بُو میں تولد ہوئی ہے۔ اس طرح وہ مشترکہ تہذیب کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ بقول مصنف:

''وہ اپنے قصبے میں مشترکہ تہذیب کا استعارہ بن کے رہ گئی تھی''

(افسانہ ''سب کی ماں'')

آخر میں اس کی موت کے وقت قصبہ کے تمام مذاہب کے لوگ اس کی تجہیز وتکفین میں اس طرح شامل ہوتے ہیں جیسے قوم کا کوئی لیڈر مر گیا ہو۔ کہانی کا اختتامیہ یوں ہوا ہے:

''انھوں نے میت کو پہلے کندھا دیا۔ لالہ نندلال نے ایک سفید شال تابوت کے اوپر ڈال دیا۔ دھنو دھوبی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ سکھ رشپال سنگھ نے روتے ہوئے ایک آدمی سے کہا

''بہاراں مائی کی موت ہم سب کی موت ہے۔ کیونکہ اب ہمارے قصبے کی کوئی بھی حاملہ عورت بغیر آپریشن کے بچہ نہیں جنے گی!''

مشتاق احمد وانی بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں۔ تانیثیت کے حوالے سے ان کا اہم کارنامہ ''اردو ادب میں تانیثیت'' ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ جس نے ادبی دنیا کو چونکا دیا ہے۔ افسانوی اور غیر افسانوی ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ شعریات سے وہ اچھی طرح

واقف ہیں۔ان کے تنقیدی مضامین سے ان کی صلاحیتوں کا خوب اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ تنقید سے افسانے کی طرف آئے۔حیرت کا مقام تب ہوتا کہ افسانوی دنیا کو چھوڑ کر وہ تنقید کی دنیا میں آتے۔ان کی مسرت آمیز آمد کا دلی استقبال ہونا چاہیے کیونکہ پیش نظر تصنیف ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔

....

محمد مستمر
مدیر سہ ماہی ''جمنا تٹ'' ہریانہ اردو اکیڈمی

مشرقی روایت کا امین: مشتاق احمد وانی

مشتاق احمد وانی کا تعلق جنت نشاں وادیٔ کشمیر سے ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نویس بھی ہیں، ناقد بھی ہیں اور محقق بھی۔ صوبۂ جموں کشمیر کے حوالے سے انھوں نے کم وقت میں بہت نمایاں مقام حاصل کرلیا ہے۔ ویسے تو مذکورہ صوبہ میں حامدی کاشمیری اور مشتاق مہدی سے لے کر وحشی سعید، نورشاہ، آنندلہر، دیپک بدکی وغیرہ افسانہ نگاروں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر مشتاق احمد وانی کا افسانہ بافی کا انداز اور تنوعِ موضوعات ان سب افسانہ نگاروں سے منفرد ہے۔ مشتاق احمد وانی کا تعلق اس نسل سے وابستہ ہے جو افسانوی منظر نامہ پر بالخصوص نوے کے بعد طلوع ہوئی اور جلد ہی اپنی طرزِ نگارش سے اپنی تحریروں کی طرف متوجہ کیا۔ جیسا کہ میں نے اپنے مضمون کا عنوان 'مشرقی روایت کا امین: مشتاق احمد وانی' دیا ہے۔ یہ بات لاریب کہی جاسکتی ہے کہ جب ہم مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ امر منکشف ہونے میں دیر نہیں لگتی ہے کہ ان کے یہاں مشرقی روایت ایک طاقتور جذبے کے ساتھ نمودار ہوتی ہے۔ وہ کوئی بھی یا کسی بھی موضوع پر افسانہ بافی کرتے ہوں، ان کے یہاں مشرقی پہلو و نکات جملوں کے بین السطور میں انکور کی طرح پھوٹتے چلے آتے ہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے ملک جس طرح کے مسائل سے دو چار ہو رہا ہے، اس مجموعے میں شامل افسانے زیادہ تر انہی موضوعات و مسائل کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں جو گذشتہ کئی برسوں سے وقوع پذیر ہو رہے ہیں نیز کچھ دوسرے موضوعات و

مسائل کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ بس ان کے افسانوں کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ موصوف کے یہاں مشرقی قدریں، رسم ورواج، للّٰہیت وخلوص اورانہی کے برعکس بغض وعناد، حسد وجلن، اورفاسدخیالات کا پرتو جلوہ گر رہتا ہے۔

جیسا کہ ہرفنکاراپنے گردونواح، ماحول اورسماج ومعاشرہ سے مہیج (Stimulus) وصول کرتا ہے، اپنی بصری وسمعی تحسیس سے ادراک حاصل کرتا ہے، مسائل پر توجہ دیتا ہے نیز اپنی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور پھر خارجی وداخلی مشاہدہ کے باہمی اختلاط اور لاشعوری خلیات سے پنپنے والے لاوے سے تخلیقات کا ظہور کرتا ہے۔ چنانچہ اس پورے پروسیجر میں فنکار کا گردنواح اور ماحول ومعاشرہ سے متاثر ومتحرک ہونا اپنے اپنے طور پر مختلف معانی ومفاہیم کا متحمل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فنکار کا فن پارہ ایک ہی موضوع پر الگ الگ تاثر چھوڑتا ہے۔ یہ بات اس لئے کہی گئی ہے کہ مشتاق احمد وانی نے کسی دوسری دنیا سے فیضان حاصل نہیں کیا اور نہ ہی ایسا ہے کہ انھوں نے دوسرے فنکاروں یا افسانہ نگاروں سے ہٹ کر انتخاب کرلیا ہو بلکہ انھوں نے جن موضوعات پر افسانے رقم کئے ہیں، انہی موضوعات پر دوسرے ہم عصر افسانہ نگار بھی خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔ بس پیش کرنے کا اپنا الگ الگ انداز ہے۔ اب اس پیش کش میں مَیں سمجھتا ہوں کہ فنکار کا تفحصِ الفاظ کے علاوہ جزئیات نگاری کا بڑا دخل ہوتا ہے اوراس پر بھی طرہ یہ کہ وہ فنکار جزئیات جیسے فنی لوازمات کو کتنی چابکدستی اور متانت سے اپنے فن پارے کا حصہ بناتا ہے۔ اب یہ فنکار کی صلاحیت، وسیع مطالعہ اوراستعداد کے اوپر منحصر کرتا ہے۔ انہی سب امور ووظائف کے ساتھ فنکار کی ذات سے وہ باتیں اورنکات بھی پیوست ہوتے ہیں جن کا تعلق انسان کی تحلیلِ نفسی سے ہوتا ہے۔ ہرفنکار کسی بھی تخلیق کو خلق کرتے وقت نفسیاتی رویوں کو ضرور ملحوظِ خاطر رکھتا ہے۔ جزئیات بھی ایسا ہی عمل ہے جس میں نفسیاتی رویے ہمیشہ تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کے موضوعات وکردار سب ہمارے معاشرہ وسماج

سے تعلق رکھتے ہیں، خاص طور پر اکیسویں صدی کے بدلتے منظر نامے اور قدروں کے شکست و ریخت سے مطابقت و مناسبت رکھتے ہیں جہاں فن پارے میں عصری حسیت بھاگے چلی آتی ہے۔ کیوں نہ آئے......؟ آخر مشتاق احمد وانی بھی اسی دنیا میں جی رہے ہیں، اسی دنیا کا مشاہدہ و معائنہ کرتے ہیں اور اسی دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل سے آنکھیں ملاتے ہیں، غور و فکر کرتے ہیں اور پھر افسانہ رقم کردیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ زیادہ تر سپاٹ اور اکہرے ہوتے ہیں نیز فلسفہ کہیں گم ہو جاتا ہے یا پس پشت چلا جاتا ہے۔ وہ موضوعات و مسائل پر توفوکس کراتے ہیں مگر فن پارہ میں گہرائی و گیرائی کہیں دب کر رہ جاتی ہے۔ مشتاق احمد وانی کا سب سے خاص وصف یہی ہے کہ ان کے یہاں مسائل و موضوعات کو مرکزیت حاصل ہے۔ ایک افسانہ نگار کا کمال یہی ہونا چاہئے کہ جہاں اس کی نگاہ کا دائرہ کار مسائل و موضوعات پر مرتکز و مجتمع ہوتا ہے تو ساتھ ہی وحدتِ تأثر جیسا فنی وصف بھی قائم و دائم رہنا چاہئے حالانکہ یہ امر بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ خالص وحدتِ تأثر اور رمزیت و اشاریت ہی افسانہ باقی نہیں بلکہ اور بھی وصف ہیں افسانے میں وحدتِ تأثر کے سوا۔ جس کا ذکر میں نے اوپر کردیا ہے کہ اگر موضوعات و مسائل اور وحدتِ تأثر کا تانا بانا صحیح بیٹھ جائے تو اچھا افسانہ منصۂ شہود پر آتا ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر مشتاق احمد وانی 'اور بھی وصف' کو اپنے افسانوں میں برتنا جانتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے قلم کی جنبش اور موشگافیاں قاری کو کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ جہاں ان کے افسانے قاری کے سامنے ملک میں وقوع پذیر حادثات و واقعات کو پیش کرتے ہیں تو وہیں اس پہلو پر بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں جس دہانے پر ملک کھڑا ہوا ہے نیز سوائے المیہ اور ستم ظریفی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جمہور لاچار و مجبور ہے، اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ دوسری جانب مشتاق احمد وانی کے یہاں وہ مسائل ہیں جہاں سے قدروں کا زوال شروع ہو رہا ہے نیز ان زوال ہوتیں قدروں کا سدِ باب شاید افسانہ نگار

کے پاس بھی نہیں مگراس کے پاس ایک دھڑکتا ہوا دل تو ہے جس میں حساسیت مکمل طور پر موجزن ہے مگر جمہور کے پاس تو اس کا بھی فقدان ہے نیز حالات بد سے بدتر تبھی ہوتے ہیں جب ملک کی جمہور اور شہری بے حس ہو جاتے ہیں۔

'قبر میں زندہ آدمی' یہ مجموعہ کا عنوان ہے۔اس افسانوی مجموعہ میں تیرہ افسانے شامل ہیں۔ان میں سے چھے افسانے خالص مشرقی روایت کے امین و پاسدار ہیں۔جن میں 'قبر میں زندہ آدمی، معاوضہ، عورت، مجھے ایک دن گھر جانا ہے، کارِ خیر، انتظارِ مرگ، سات نمبر کا پاپوش، شامل ہیں۔یہ ایسے افسانے ہیں جو خالص مشرقی رسم و رواج، شکست و ریخت ہوتیں قدریں، محبت وللٰہیت کا فقدان، بڑوں کی بے حرمتی، مٹتی ہوئی غیرت وحمیت اور پنپتی ہوئی خود غرضی و مفاد پرستی، مغربی تہذیب کے مرتسم ہوتے ہوئے اثرات اور تحلیل ہوتے ہوئے عناصر وغیرہ نکات کو پیش کرتے ہیں نیز قاری کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں، دل میں پیدا ہوئی بے غیرتی کو للکارتے ہیں۔اس طرح مشتاق احمد وانی اپنے افسانوں میں ایک پیغام چھوڑ جاتے ہیں۔

'قبر میں زندہ آدمی' افسانہ ایک ایسے آدمی کی کہانی کو پیش کرتا ہے جو بہت زیادہ ثروت مند ہے۔لیکن ساتھ ہی عیاش وشرابی بھی ہے۔اس آدمی کا نام یار خان ہے جو جنسی کجروی و بدراہی کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔اس کی بیوی حسینہ بیگم ایک متقی و پرہیز گار خاتون ہے نیز دونوں شوہر بیوی متضاد صفت کے مالک ہیں۔حسینہ بیگم اپنے خاوند یار خان کو بہت سمجھاتی ہے کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں۔لیکن یار خان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ایک روز کیا ہوتا ہے کہ یار خان کے بھتیجے کی شادی تھی۔شادی کا انتظام بینکٹ ہال میں کیا جاتا ہے۔یار خان کو رفع حاجت ہوتی ہے۔وہ بیت الخلاءُ میں داخل ہوتے ہیں لیکن ہوتا کیا ہے کہ بیت الخلاءُ کے قفل میں کمی کے باعث دروازہ نہیں کھلتا، دوسری جانب بجلی بھی گُل ہو جاتی ہے۔یار خان کے ہوش فاختہ ہو جاتے ہیں۔انھیں لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی قبر میں مقید ہو

گئے ہوں۔ موت ان کے سامنے منڈلانے لگتی ہے۔ دو گھنٹہ اسی کشش و پیچ اور گھبراہٹ کے عالم میں گزر جاتے ہیں۔ ان کی گھبراہٹ کا عالم افسانہ کے اس اقتباس سے لگا سکتے ہیں:

''اب یار خان کو اپنے آس پاس موت کے سائے منڈلاتے معلوم ہونے لگے۔ اپنی زندگی بھر کے گناہ یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے۔ اب انھیں اللہ اور اللہ کے رسول یاد آئے۔ وہ اپنے آپ کو جیتے جی قبر میں سمجھنے لگے۔''

''یا اللہ میری مدد فرمائیے۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ یار خان پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ بیت الخلاٗ کی تاریکی، گرمی تعفن اور گھٹن کے سبب انھیں یوں محسوس ہونے لگا کہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ زندگی کی آخری ہچکی لیں گے۔''

اور پھر اس حادثہ کے بعد یار خان کی زندگی کا ٹرننگ پوئنٹ شروع ہوتا ہے۔ وہ تمام برائیوں کو ترک کر کے صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو جاتے ہیں اور فلاح و بہبود کے کاموں میں اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ نیز پکے سچے مومن کی طرح زندگی گزارنے لگ جاتے ہیں۔

'عورت' افسانہ کا مرکزی کردار رام دلاری ہے۔ رام دلاری متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل کرتی ہے۔ ایک امیر زادے کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن وہ امیر زادہ اسے دھوکا دے دیتا ہے۔ مگر رام دلاری محبت میں ناکام دیگر لڑکیوں کی طرح اداس نہیں ہوتی اور نہ ہی اندرونی طور پر وہ ٹوٹتی اور منتشر ہوتی ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو خواتین کی فلاح و بہبودی کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ نیز وہ رضا کارانہ طور پر خواتین کمیشن کی ممبر بن جاتی ہے۔ خواتین کمیشن کے چیئر مین رام دلاری کو یہ ذمہ داری سپرد کرتے ہیں کہ تم ان اسباب وعلل کا پتہ لگاؤ گی جس باعث عورتیں آج ذلیل وخوار ہو رہی ہیں۔ کیوں ان کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ریپ کئے جا رہے ہیں؟ آخر ان تمام امور کی بنیادی وجوہ کیا ہیں۔ چنانچہ افسانے کا لب لباب یہ ہے کہ رام دلاری اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ عورت کی تذلیل کے عقب میں یہ اساسی پہلو کارفرما ہے کہ عورت آج بے پردہ ہوگئی

ہے۔ جب رام دلاری کمیشن کے چیئر مین کے سامنے اپنی یہ رائے پیش کرتی ہے تو سب یہ سن کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں لیکن رام دلاری نے بڑے عمیق مشاہدہ و تجربہ کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کی تھی۔ چنانچہ جب وہ کمیشن کے سامنے تمام دلائل سے اپنی بات کو مضبوطی کے ساتھ بتاتی ہے تو سبھی سرِ خم تسلیم کر لیتے ہیں۔ 'مجھے ایک دن گھر جانا ہے' افسانہ میں مشتاق احمد وانی نے اُس محسن نام کے آدمی کی کہانی کو بیان کیا ہے جواب سے اٹھائیس برس قبل ماں باپ کی مرضی کے خلاف شہر میں اعلا تعلیم حاصل کرنے آتا ہے، والدین اپنے بیٹے محسن کو اس لئے شہر بھیجنا نہیں چاہتے کیوں کہ شہر میں جا کر لڑکے شہر کے ہی ہو جاتے ہیں اور اپنی مرضی سے ہی کسی شہری لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کیوں لڑکے شہر میں شادی کر لیتے ہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں کنواری رہ جاتی ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہ شہری زندگی میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ اپنی مشرقی روایات واقدار کو بھی بھول جاتے ہیں۔ یہی سب کچھ محسن کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ محسن کو زندگی کی سب آسائش و آرام تو میسر ہوتے ہیں لیکن زندگی کی چکا چوند میں وہ اپنا سب کچھ گنوا دیتا ہے۔ انہی تانے بانے کو لے کر مشتاق احمد وانی نے یہ افسانہ بُنا ہے۔ مزید افسانے کے مرکزی خیال کو سمجھنے کے لئے افسانہ کا یہ آخری اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''پاپا...... مما کہہ رہی ہیں کہ پانچویں منزل کا پروگرام بنایئے۔ آپ کو دو سال بعد ریٹائر ہونا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو کمپیوٹر سینٹر کھولنا ہے۔''

''بیٹی...... مما سے کہئے کہ پاپا کہہ رہے ہیں، مجھے ایک دن گھر جانا ہے۔''

'کارِ خیر' افسانہ واقعی اپنے عنوان کے حساب سے اسمِ با مسمیٰ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار گل محمد ہے۔ گل محمد ایک اعلا تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا آدمی ہے۔ لیکن اپنی ماں کی موت کے بعد گُل محمد کے دل کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ وہ نفسِ امارہ کی بجائے، نفسِ مطمئنہ کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ اِڈ کے تمام مجادلوں پر وہ قابو پا لیتے ہیں نیز تزکیۂ نفس کے

تحت ایک فرشتہ صفت انسان اور مردِ مومن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔لیکن ہوتا کیا ہے کہ مسروقہ بیگم نام کی کوئی طوائف ان کے محلّہ میں ڈیرہ ڈال لیتی ہے اور رقص وسرود کی محفلیں آراستہ وپیراستہ کرنے لگ جاتی ہے۔گل محمد کے لئے یہ امر تشویش کا باعث بن جاتا ہے۔وہ تہیہ وعہد کرتے ہیں کہ وہ مسروقہ بیگم کو بدراہی سے راہِ رشید پر لاکر ہی چھوڑیں گے۔ چنانچہ مسروقہ بیگم اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ وہ تائب ہو جاتی ہے۔اس افسانہ کا لبِ لباب، نقطہ عروج اور مرکزی خیال یہی ہے کہ اگر دل میں ذوقِ یقین اور للّٰہیت و رضائے الٰہی ہو نیز خود انسان پارسا و مخلص ہو تو یقینی بات ہے کہ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔'انتظارِ مرگ' افسانہ میں مشتاق احمد وانی نے شکست و ریخت ہوتیں قدریں، نئی نسل کی جہالت بلکہ نافرمانی و بدتمیزی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس موضوع پر بہت سے افسانہ نگاروں نے افسانے رقم کئے ہیں۔افسانہ کا موضوع یہ ہے کہ جوان بیٹا اور بہو سلام دین کو جو ضعیف ہو چکا ہے، اب ایک بوجھ، فالتو اور بے کار چیز سمجھنے لگتے ہیں جبکہ آج سب کچھ جوان کے پاس ہے، وہ سلام دین کا ہی تو کمایا ہوا ہے۔افسانے کا اختتامیہ اقتباس دیکھئے:

''عدنان نے آہستہ سے اپنے دادا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگا۔''دادا جی......دادا جی۔آپ کب مریں گے......؟''

''سلام دین نے اپنے لاڈلے پوتے کو گلے لگایا۔اس کے سر پہ اپنا دستِ شفقت پھیرا، ماتھے پر بوسہ دیا اور پھر اسے کہنے لگے۔''میرے لعل کے لعل، میرے جگر پارے۔موت کا کیا پتہ کب آئے۔مگر آج آپ مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو......؟''

عدنان نے کہا'' دادا جی ممی ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ جب دادا جی مر جائیں گے تو اس کے بعد ہم آرام سے گھر میں ٹیلی وژن دیکھیں گے۔''

اتنا سننا تھا کہ سلام دین کو دورہ پڑتا ہے اور حرکتِ قلب وہیں ساکت ہو جاتی ہے

نیز یہ صدمہ وہ برداشت نہیں کرتے۔ افسانے کا نچوڑ و ماحصل یہی ہے کہ یہ نوجوان نسل کیوں یہ بھول رہی ہے کہ ایک ایک دن ہمیں بھی بوڑھا ہونا ہے لہٰذا ''جو بوئے گا کاٹے گا وہی کل''۔ معاوضہ افسانے کا مرکزی کردار کرم دین ہے۔ وہ اپنی محنت وصلاحیت وذہانت کے بل پر اردو کا ایک بہت بڑا ادیب، ناول نگار اور کہانی کار تو بن جاتا ہے مگر وہ اردو کا پروفیسر نہیں بن پاتا۔ کرم دین صوم وصلوٰۃ کا پابند، دیندار وایماندار اور للّٰہیت وخلوص کا پیکر و مجسمہ ہے۔ ہمیشہ اس نے راہِ رشید کو ہی چنا۔ غلط سسٹم سے کبھی اس نے سمجھوتا نہیں کیا۔ اس کا ایک دوست ہے دھرم چند جو ہندی کا پروفیسر ہو جاتا ہے۔ وہ کرم دین کی شہرت ومقبولیت کی بہت تعریف کرتا ہے لیکن ساتھ ہی کرم دین کے پروفیسر نہ بننے پر کفِ افسوس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ دھرم چند وجہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر وہ کیوں اتنا قابل ہوتے ہوئے بھی اردو کا پروفیسر نہیں بن پایا۔ اب جو جواب کرم دین دیتا ہے وہ جملے ملاحظہ فرمائیں جن پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

''میرے دوست......میرے پاس نہ زر تھا نہ پر۔''

پروفیسر دھرم چند نے بڑی بے تابی اور تجسس آمیز رویے سے پوچھا

''تو پھر تیرے پاس کیا تھا......؟''

کرم دین نے جواب دیا۔

''دھرم چند......یار میرے پاس توحید و رسالت کی عظمت وفضیلت، پانچ وقت کی نمازوں کی ٹھنڈک، رمضان المبارک کے تیس روزوں کا تقویٰ، عشرہ وزکوٰۃ کی اہمیت و افادیت اور حج وعمرہ کی تمنا بھی۔ چنانچہ دو متضاد طبیعتوں کے سنگم میں بُری طرح مجھ سے میرا حق چھینا گیا۔''

مختصر یہ کہ مشتاق احمد وانی نے 'معاوضہ' افسانہ میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پروفیسر کی تقرری میں ہو رہی دھاندلیوں اور رشوت خوری کی قلعی کھولنے کی سعی کی ہے۔ اس

میں کوئی دورائے نہیں کہ قابل امیدوار آج حاشیہ پر ایستادہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کرم دین کی طرح زہد و ورع اور صوم وصلوٰۃ کے پیکر و مجسمہ تو نہیں تاہم 'معاضہ' کا پہلو پختگی کا حامل ہے۔ یہ المیہ بھی ہے اور امیدوار کے ساتھ ستم ظریفی بھی۔

علاوہ بریں دوسرے افسانے بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ 'انتقام' افسانہ مادہ جنین کشی پر اچھا افسانہ ہے۔ جس میں نوید الرحمان لڑکے کی چاہت میں اپنی بیوی کا اسقاطِ حمل کرانے کے لئے ڈاکٹر کے یہاں جاتا ہے جہاں اسے عین موقع پر ہی پولس پکڑ لیتی ہے اور ساتھ ہی ڈاکٹر کو بھی گرفتار کر لیتی ہے۔ افسانہ میں مزید دُکھ اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جہاں اسلام میں لڑکی کو رحمت بتایا گیا ہے نیز جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ خود لے رہا ہے اور لڑکی والے کے لئے اللہ نے مبینہ طور پر اعلان کر دیا کہ لڑکی والوں کے لئے جنت واجب ہے۔ وہاں بھی نوید الرحمان جیسے لوگ ایسی گھناؤنی حرکت کو انجام دے رہے ہیں۔ 'سب کی ماں' افسانہ میں مشتاق احمد وانی نے ایک ایسی بزرگ عورت کی نفسیات کو پیش کیا ہے جو اسّی سال کو تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن اس عمر میں بھی اس کے اندرونی و بیرونی میکانکی آخذات درست ہیں۔ بطور پیشہ وہ دائی ہے۔ حالانکہ اس کے پاس اب کوئی کمی نہیں ہے تاہم اس پیشہ میں اس کو جو دلی سکون میسر ہوتا ہے، اس میں مخفی نفسیاتی پہلو کو وہی محسوس کر سکتی ہے، اس نے کئی دور دیکھے ہیں، کئی نسلوں کو جوان اور بوڑھے ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ویسے تو مسلم ہے مگر پوری بستی کی ماں ہے۔ سب لوگ اسے 'ماں' کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں۔ وہ بھی ماں کہلوانا ہی پسند کرتی ہے۔ ماں کہلوانے میں اسے جو دائمی راحت حاصل ہوتی، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اللہ نے اس کے ہاتھ میں ایسی شفا رکھی ہے کہ بھلے ہی زچہ کا کیس کتنا ہی سیریس ہو، وہ فوراً حل کر دیتی ہے۔ ایسا شفا بخش پہلو اس کا تجربہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہندو مسلم، سکھ سب اس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ وہ ہندو مسلم ایکتا کی مثال ہے۔ وہ اسوۂ حسنہ کا نمونہ ہے۔ بالکل فرشتہ

صفت۔ نماز روزے کی پابند، اتحاد و اتفاق کی مورت بلکہ ساکشات دیوی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرتی ہے تو پورا گاؤں صدمے میں آجاتا ہے۔ بس افسانے کے آخری جملے ملاحظہ فرمائیں:

''بہاراں دائی کا چہرہ بہت زیادہ نورانی نظر آرہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ مسکرا رہی ہوں۔ جوں ہی تابوت اٹھانے لگے تو ہندو اور سکھ برادری کے لوگ آئے۔ انھوں نے پہلے میت کو کندھا دیا۔ لالہ نندلال نے روتے ہوئے ایک سفید قیمتی شال تابوت کے اوپر ڈال دیا تھا۔ دھنو دھوبی دھاڑیں مار مار رو رہا تھا۔ سکھ رشپال سنگھ نے روتے ہوئے ایک آدمی سے کہا۔

''بہاراں مائی کی موت ہم سب کی موت ہے کیونکہ اب ہمارے قصبہ کی کوئی بھی عورت بغیر آپریشن کے بچہ نہیں جنے گی۔''

چار چہرے، ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی، واپسی اور سات نمبر کا پاپوش، یہ افسانے بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی، افسانہ کرپشن اور رشوت خوری جیسے مسئلے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں لعل محمد بدعنوانی کے باعث اپنا جی پی فنڈ نکلوا نہیں پاتا۔ جی پی فنڈ نہ نکلنے کی وجہ سے وہ بہت زیادہ تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اپنی بیٹی کی شادی جو کرنی ہے۔ دفتری عملہ اسے بے وقوف بناتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ انھیں رشوت نہیں دے پاتا۔ اسی شکایت کو لے کر وہ شہر کے چیئر مین کے پاس جاتا ہے لیکن نتیجہ صفر برآمد ہوتا ہے۔ لعل محمد کہتا ہے کہ جب میرا اپنا پیسا ہے تو پھر رشوت کس نام کی؟۔ چنانچہ چیئر مین صاحب اسے یہ فلسفہ بتاتے ہیں کہ یا تو حالات سے سمجھوتہ کرلو نہیں تو اگر بغیر پیسوں کے کام کرانا چاہتے ہو تو یہ رویہ اپناؤ کہ 'ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی' لعل محمد بھلا بے چارہ ایک بابو، شریف النفس جس کا شیوہ صرف اور صرف شرافت و ایمانداری رہا ہو کیسے اس فلسفہ پر عمل کر سکتا تھا۔ درحقیقت یہ سب کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ آخر کیوں ہو رہا ہے......؟ شاید

اس کا اثزالہ افسانہ نگار کے پاس بھی نہیں۔ باقی افسانے میں قارئین حضرات کے لئے چھوڑ رہا ہوں کہ وہی خود مطالعہ کریں نیز سمجھیں اور جانیں کہ مشتاق احمد وانی کن کن المیوں اور ستم ظریفیوں کو اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ بات مشتاق احمد وانی کے تعلق سے کہی جاسکتی ہے کہ موصوف کے افسانے خالص بیانیہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ سماج و معاشرہ کا مشاہدہ کرتے ہیں نیز سماج میں پھیلی بدعنوانیوں پر قدغن لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سماج کو ایک ایسے دھاگے میں پرونا چاہتے ہیں کہ جہاں پر اخوت قائم ہو، اتحاد کا جنم ہو، مشترکہ تہذیب کو فروغ ملے نیز گنگا جمنی تہذیب کا درخت سرسبز و شاداب ہو۔ لہٰذا انہی سب عناصر و نکات کے مابین پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ مشرقی روایات واقدار کو، جوان کے افسانوں کی انفرادیت بھی ہے، طرۂ امتیاز بھی ہے اور فنی تخصیص بھی۔ چنانچہ موصوف کا افسانوی سفر روز بہ روز ترقی کی طرف گامزن ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اسی انہماک، تندہی اور عرق ریزی کے ساتھ افسانوی دنیا کو نئی سمت و جہت عطا کرتے رہیں گے۔

....

محمد غالب نشتر
[رانچی]

مشتاق احمد وانی کا افسانوی مزاج

مشتاق وانی کا تعلق اکیسویں صدی کی اُس افسانوی نسل سے ہے جہاں فنکار، ایک چیلنج سے گزر رہا ہے اور وہ چیلنج ہیئت سے زیادہ مواد کا متقاضی ہے۔ کسی موضوع کو کس طرح سے بیان کرنے کے بجائے کیا بیان ہونا ہے، وہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ نئے عہد میں موضوعات کے مسائل، افسانہ نگار کے سامنے صف بستہ کھڑے ہیں کہ وہ کسی بھی طور پر قبول کرلیں۔ اس صدی نے فکشن نگاروں کو کئی اہم موضوعات دیے ہیں جن میں دہشت گردی کا مسئلہ، دلت مسائل، نئی ٹکنالوجی کی بربریت، بین الاقوامی طور پر شکست و ریخت، اقلیت کی شناخت کا مسئلہ، کشمیر کی تباہ کاریاں الغرض ایسے کئی اہم مسائل ہیں جن کو اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اپنے اپنے طور پر برتا ہے۔ افسانہ نگار کا تعلق چوں کہ کشمیر سے براہ راست ہے، اسی لیے موزوں معلوم ہوتا ہے کہ اس حوالے سے لکھی گئی کہانیوں کا ذکر کیا جائے۔ علمی و ادبی لحاظ سے وادیٔ کشمیر ایک مردم خیز علاقہ ہے۔ اُردو ادب کے اُفق پر اپنی تابناکیاں بکھیرنے والے کئی بلند مرتبت نام اسی وادیٔ جنت نظیر سے اُٹھے، مثلاً چراغ حسن حسرت، علامہ اقبال، سعادت حسن منٹو اور کئی اہم شخصیات جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔ فکشن نگاروں میں دیپک کنول، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، برج پریمی، دیپک بدکی اور نہ جانے کئی ایسے فنکار ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طور پر جنت ارضی کی تعریف کی ہے اور وہاں کے مسائل کو کسی نہ کسی طور پر بیان

کیا ہے۔ وادیٔ کشمیر جنت نظیر کا حُسنِ بلاخیز تخلیق کاروں کو ہمیشہ مسحور کرتا رہا۔ سر بفلک کوہسار، برف پوش وادیاں بل کھاتے دریا، اُمڈتے چشمے گنگناتی آبشاریں، وسیع سبزہ زار، لہلہاتے کھیت، سیبوں، ناشپاتیوں، انگوروں کے باغات، بادام اخروٹوں کے پیڑ، گلنار چہرے اور سحر ناک حسن، یہ وادیٔ لولاب واقعی زمین پر جنت کا ٹکڑا ہے۔ اُردو شاعری میں جہاں اس کے حسن کے تذکرے موجود ہیں۔ وہیں افسانہ نگار بھی اس وصف سے خالی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے تو اسے اور بھی سبزہ زار بنایا ہے۔ کئی اعلیٰ درجے کے ناول لکھے گئے، کچھ کشمیر کے پس منظر میں سماجی حوالے سے لکھے گئے اور کچھ ناول سیاسی حوالے سے تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور کشمیریوں پر ڈھائے گئے مظالم کو موضوع بنا کر تحریر کیے گئے۔ اس ضمن میں سب سے بڑا نام کرشن چندر کا ہے جن کے ناول شکست، مٹی کے صنم، برف کے پھول وغیرہ کشمیر کے پس منظر میں تصنیف ہوئے جب کہ ان کے دو ناول ''میری یادوں کے چنار'' اور ''طوفان کی کلیاں'' تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو موضوع بناتے ہیں۔ یہ دونوں ناول اُس عہد کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں جب کشمیر میں ڈوگرہ راج کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی تھی اور مقامی افراد کے جذبات واحساسات اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا پرتو ان دونوں ناولوں میں موجود ہے۔ معروف کشمیری ادیب ٹھاکر پونچھی کے افسانوں کے کئی مجموعے چھپے، اُنھوں نے بھی کشمیر کے پس منظر میں متعدد ناول لکھے۔ افسانوں کی بات کریں تو اس فہرست میں کئی اہم نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے اس پاک سرزمین کی عکاسی کی ہے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ویریندر پٹواری، نور شاہ، دیپک بدکی، ترنم ریاض اور دیگر کئی ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا براہ راست تعلق کشمیر سے رہا ہے۔ کرشن چندر نے 'کشمیر کو سلام' اور 'نیا مدرسہ' سعادت حسن منٹو کا 'ٹیٹوال کا کتا' اور 'آخری سیلوٹ'، ویریندر پٹواری کا 'آدم' اور 'سزا'، نور شاہ کا 'بے ثمر سچ' اور دیپک بدکی کے 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اور 'نہتے مکان کا ریپ' ایسے شاہکار فن پارے ہیں جنھیں کشمیر کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر

مشتاق احمد وانی کی کہانیوں میں 'دہری مار' اور 'جنم بھومی کے آنسو' کو بھی کسی بھی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک فنکار کا جب کسی مسئلے سے براہ راست تعلق ہوتا ہے تو وہ ڈوب کر کہانیاں لکھتا ہے اور یہی صورتحال ڈاکٹر وانی کی ہے۔ چہ جائے کہ یہ کہانیاں اُن کے سابقہ مجموعے میں شامل ہیں لیکن ہمیشہ سے موضوع بحث بنے رہنے کی متقاضی ہیں۔

مشتاق وانی سماجی حقائق کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ ایسی حقیقتیں جو ہمارے معاشرے کا ناگزیر حصہ بن چکی ہیں۔ جہاں رشتوں کی شکست وریخت ہے، اقدار پامال ہو رہے ہیں اور ترقی کی منازل طے کرنے کی حرص، انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں دلا رہی ہیں کہ وہ بھی اس جہنم کا ایندھن بنتے جا رہے ہیں۔ 'انتظار مرگ' اسی کرب سے گزرتی کہانی ہے جہاں ایک بہو کے ساتھ مل کر اُس کا شوہر یعنی سلام دین کا حقیقی وارث جلال دین اپنے باپ کے لیے ایسی بددعائیں کرتا ہے جو حقیقی نہ معلوم ہوتے ہوئے بھی ہمارے سماج میں حقیقی تصور کی جا سکتی ہیں۔ باپ ایک سیدھا سادا مسلمان ہے، اُسے عاقبت کی فکر ہے، ساتھ ہی گھر والوں کو بھی اس آگ سے بچانا چاہتا ہے لیکن میاں بیوی کو آزادی کی پڑی ہے۔ دینا و مافیہا سے آزادی، تمام رشتے داروں سے آزادی، حتیٰ کہ اپنے باپ سے آزادی....وہ ٹیلی ویژن دیکھنا چاہتے ہیں لیکن سلام دین، جو اسم با مسمیٰ ہے، انھیں اس کام سے باز رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ بیٹے کی بے حسی کا تو یہ عالم ہے کہ باپ کو کھانسی کی بیماری ہے لیکن وہ محض اس وجہ سے اپنے باپ کا علاج نہیں کراتا کہ باپ کے رت جگے سے گھر میں کم از کم چوریاں تو نہیں ہوں گی۔ اس سے بڑھ کر معاشرتی تنزلی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ خونی رشتے میں اس طرح کے معلاملات سامنے آئیں۔ اس کہانی میں میاں بیوی [زمانۂ حال] اور بچہ [مستقبل] کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

ڈاکٹر وانی نے اپنے اطراف واکناف میں پیدا ہونے والی سماجی برائیوں کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور اسی کا برملا اظہار اپنی کہانیوں میں کیا ہے۔ ایک فنکار زمانے کا

نباض، فرد شناس اور نفسیات کا ماہر ہوتا ہے، اسے قرب وجوار میں ہونے والے تمام حقائق کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ حساس اور محتاط ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ذات پات ہمارے معاشرے کا ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔ آج بھی دلتوں اور آدی باسیوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ منڈل کمیشن کے نفاذ کے بعد اونچی اور نیچی ذاتوں میں ٹکراؤ کی صورتحال پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ دلت مسائل کو دیکھتے ہوئے ادبیاتِ عالم میں 'دلت ادب' کا اختراع کیا ہے لیکن اس میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ دلت ادب میں کن ادیب اور کن تخلیق کاروں کو شمار کیا جائے گا۔ یہاں وہ امور واضح کیے جا رہے ہیں تا کہ دلت ادب کی وضاحت ہو سکے۔

☆ نظامِ ذات پات اور سماجی حیثیت میں سب سے نچلے طبقے پر رہنے والے لوگوں کے مسائل کی عکاسی کرنے والا ادب۔

☆ برہمنی نظام کے خلاف بغاوت اور شودروں اور اچھوتوں کے حق و انصاف کے لیے آواز بلند کرنے والا ادب۔

☆ چھوا چھوت اور انسانی اقدار کی پامالی کے خلاف اور انسانیت کے حق میں آواز اٹھانے والا ادب۔

☆ بابا امبیڈکر کے تصورات پر عمل پیرا ہونے والا ادب۔

مذکورہ بالا نکات سے بہت سے لوگوں میں اتفاق رائے قائم نہیں ہو سکی ہے۔ کچھ کا ماننا ہے کہ دلت ادیب ہی سچا دلت ادب تخلیق کر سکتا ہے کیوں کہ اس کی تحریریں ذاتی تجربوں پر مبنی ہوں گی۔ اس لیے دلت ادیب کا تخلیق کردہ ادب ہی اصل معنوں میں سچا اور مستند دلت ادب کہلائے گا۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ غیر دلت ادب کے زمرے میں شمار کرنا چاہیے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ تاثیر، شدت، درد، ناکامی، محرومی و بے بسی کی جھلک اس شکل میں نظر نہ آئے جو دلت ادیب کے یہاں موجود ہو۔ منڈل کمیشن کے

نفاذ اور اس سے پیدا شدہ صورت حال پر سلام بن رزاق، اسرار گاندھی، جیلانی بانو، انور قمر، دیپک بدکی، ابن کنول، شوکت حیات، صغیر رحمانی، احمد صغیر اور شفق وغیرہ نے افسانے تحریر کیے۔ مشتاق احمد وانی کا افسانہ 'واپسی' اسی فکر کی غمازی کرتا ہے۔ کہانی 'واپسی' ایک ایسے سماجی برائی کی کہانی ہے جو ہمارے معاشرے میں ناسور کی طرح پھیلتی چلی جارہی ہے۔ اور وہ ناسور ہے سماجی نابرابری۔ وہ خواہ مسلمانوں میں ہو یا ہندوؤں میں، برائی تو آخر برائی ہے۔ کہانی طربیہ انداز سے شروع ہوتی ہے لیکن اُس کا انجام المیہ ہوتا ہے۔ دیارام، ایک دلت کردار ہے جسے زمانے نے اُسے دلت ہونے کی وجہ سے بہت ستایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جدید ٹکنالوجی کے دور میں بھی یہ برائی ختم نہیں ہوئی ہے۔ دیارام کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جس سے وہ اپنے مذہب سے بدظن ہو کر مذہب اسلام سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اور نوبت یہاں تک آ پہنچتی ہے کہ وہ زمانے کے مشہور عالم کے پاس اسلام قبول کرنے کے لیے مع اہل وعیال پہنچ جاتا ہے۔ مولانا اُس سے وجہ دریافت کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ مفتی صاحب! مجھے مذہب اسلام میں آفاقیت، صداقت اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ ہمارا سماج چوں کہ فرقوں میں بٹ چکا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ مذہب اسلام سب سے بہتر مذہب ہے۔ لیکن مولانا جب حقیت حال سے واقف کراتے ہیں تو وہ الٹے پاؤں واپس چلا جاتا ہے۔

اس کہانی میں وانی نے اپنے مذہب کے تعلق سے جس جذباتیت کا اظہار کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے اور ایک مقام پر آکر قاری اس تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وانی صرف اپنے مذہب کی تبلیغ میں وقت صرف کررہے ہیں۔ لیکن مولانا کی شکل میں وانی کا کردار اپنے سماج کی برائیوں کا انکشاف کرتا ہے تو کہانی بیلنس وے میں اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس طرح سے کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مشتاق احمد وانی کہانی کے پلاٹ، بنت اور ترتیب سے بخوبی واقف ہیں۔ اس تازہ مجموعے میں کئی ایسی کہانیاں ہیں جو قاری

کی توجہ اپنی جانب کشید کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔مثال کے طور پر" قبر میں زندہ آدمی"، عورت" مجھے ایک دن گھر جانا ہے" سات نمبر کا پاپوش" معاوضہ" ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی" سب کی ماں" انتقام" حاضر جواب" کارخیر" اور" چار چہرے"۔یہاں ایک بات اطلاعاً عرض ہے کہ مشتاق احمد وانی کہانی کے فن سے پورطرح واقف ہیں، کسی بھی واقعے یا خیال کو کہانی کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔وہ ایک افسانہ نگار کے ساتھ بہترین ناقد بھی ہیں اور اُن کی چھ کتابیں 'اردو ناول میں تہذیبی بحران' آئینہ در آئینہ، اعتبار و معیار، شعور بصیرت، 'اردو ادب میں تانیثیت' اور 'افہام وتفہیم زبان وادب' طلبا کے درمیان خاصی مقبول رہی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ مجھے قوی امید ہے کہ سابقہ مجموعوں کی طرح اس مجموعے کی بھی خاصی پذیرائی ہوگی۔

....

مجھے ایک دن گھر جانا ہے

اپنے مکان کی چوتھی منزل پہ جونہی محسن میاں نے قدم رکھا تو انھیں یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے مکان سے پورے شہر پہ نظریں دوڑا سکتے ہیں۔ وہ ایکسائز انسپکٹر تھے لیکن ان کے دل ودماغ میں یہ بات رچ بس چکی تھی کہ حرام کی کمائی میں آدمی کو آرام نہیں ملتا۔ جائز وناجائز کا سبق انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں پڑھا تھا جو انھیں اچھی طرح یاد رہ گیا تھا۔ حسن اخلاق سے ہر کسی کا دل جیتنے میں خاصے ماہر ہو گئے تھے۔ وہ کرسی پہ بیٹھ گئے اور اپنی دھن میں بڑی مترنم آواز میں کبیر کا یہ دوہا گنگنانے لگے

بھلا کسی کا کر نہ سکو تو بُرا کسی سے مت کرنا
پُشپ نہیں بن سکتے تم تو کانٹے بن کر مت رہنا

بیٹھے بیٹھے اچانک ان کا ذہن ماضی کی جانب گھوم گیا۔ انھیں اپنی وہ جائے پیدائش اور وطن مالوف کا جغرافیہ یاد آ گیا کہ جہاں چاروں طرف فلک بوس پہاڑ، اوبڑ کھابڑ راستے، زمینداروں کی غیر ہموار زمینیں، گھنے سیاہ جنگل کہ جن میں چھپے ہر طرح کے درندے اپنے شکار کی تلاش میں رہتے۔ سڑک، بجلی اور پانی کا کوئی معقول سرکاری انتظام نہیں ہوا کرتا تھا۔ گویا پسماندگی اس علاقے کا مقدر بن کے رہ گئی تھی۔ جاڑے کے موسم میں جب برف پڑتی تو پورا علاقہ سفید پوش ہو جاتا۔ ڈھور ڈنگر اور دوسرے جانور گھروں میں مقید ہو جاتے۔ تقریباً تین ماہ شدید سردی کی وجہ سے لوگ باگ اونی کپڑوں میں ملبوس دکھائی دیتے۔ پورے علاقے میں ایک ہائی اسکول تھا اور علاقہ کئی گاؤں پہ مشتمل تھا۔ بسنت رُت آتے ہی طرح طرح کے جنگلی پھول کھلنے لگتے۔ خاص طور پر ناشپاتی اور ساڑی کے پیڑوں پہ کھلے

ہلکے سفید گلابی رنگت کے پھول آنکھوں کو اتنے خوب صورت اور خوشنما لگتے کہ جی چاہتا تھا انھیں دیکھتے ہی رہیں۔ چاروں طرف ہریالی اور خوشحالی کا سماں دکھائی دیتا۔ کوئل، پپیہے، رنگیلا، گوریا، کُکو، طوطے اور کبوتروں کے جھنڈ آسمان کی وسعتوں میں پر پھیلائے اپنی اپنی بولی بولتے ہوئے گزر جاتے۔ سال کے چاروں موسم اپنا اپنا لطف فراہم کرتے۔ مانا کہ دیہاتی زندگی کٹھنائیوں سے پُر ہوتی ہے، شہری زندگی سے بالکلیہ طور پر الگ، لیکن کوہستانی حُسن اور دیہاتی ماحول وفضا کی بوباس ہر کسی کا من موہ لینے والی ہوتی ہے۔

محسن میاں کو اپنی گذشتہ زندگی کے کئی حالات وواقعات یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے۔ ان کے والدین کا پیشہ زمینداری تھا۔ محسن میاں کا ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ محسن میاں اپنے بھائی بہنوں سے بڑے تھے۔ جب انھوں نے اپنے علاقے کے ہائی اسکول سے امتیازی نمبرات کے ساتھ دسویں کلاس کا امتحان پاس کیا تو انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ضد باندھی۔ مگر ان کے والدین اور خاندان والوں نے انھیں سختی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے منع کر دیا تھا۔ جب محسن میاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر بہت زیادہ بضد ہوئے اور یہ اعلان کر دیا کہ وہ یا تو خودکشی کریں گے یا پھر گھر سے بھاگ جائیں گے، تو ان کے والدین اور خاندان کے لوگ تشویش میں پڑ گئے۔ والدین نے بہت سمجھایا کہ بمشکل گھر کا خرچہ چلتا ہے۔ تم دسویں پاس ہو گئے ہو، کافی ہے، گھر پر رہو، کوئی کسب سیکھو۔ شہر میں جا کر تم پڑھائی کرو گے اور ہمیں مصیبت میں ڈالو گے۔ تمہاری پڑھائی کے اخراجات ہم پورے نہیں کر پائیں گے، اس لیے گھر میں بیٹھو۔ والدین کی باتیں سن کر محسن میاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ تب انھوں نے اپنے والدین کو جواب دیا تھا

''میں آپ سے پڑھائی کا خرچہ نہیں مانگوں گا، شہر میں جا کر محنت مزدوری کروں گا اور اس طرح اپنی پڑھائی کے اخراجات پورے کر لوں گا لیکن مجھے آگے پڑھنے دیجیے''

محسن میاں کی ماں نے بالآخر دل پہ پتھر رکھتے ہوئے اپنے شوہر کو سمجھا دیا تھا

''بیٹے کو پڑھنے دیجئے۔ پڑھ لکھ کر بہر حال ایک دن واپس گھر آ جائے گا بصورت دیگر اگر بچے ہی خودکشی کر لے یا گھر سے بھاگ جائے تو ہمیں کیا حاصل ہوگا''

محسن میاں کے والد محترم نے ہاں ناں میں کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموش رہے اور پھر کچھ دیر بعد محسن میاں کی ماں سے اپنی جگہ کہنے لگے تھے

''تم نے محسن کی پڑھائی کے بارے میں یہ فیصلہ اتنی جلدی کیسے لیا۔ ابھی اس بارے میں گاوں کے عمر رسیدہ بزرگوں سے مشورہ کرنا ضروری ہے''

محسن میاں کی ماں نے روکھے پن سے جواب دیا تھا

''مشورہ تو ہم میاں بیوی کا ہونا چاہیے گاوں کے عمر رسیدہ لوگوں سے اس بارے میں کیا مشورہ کرنا''

محسن میاں کے والد نے کہا تھا

''ہر کام کرنے سے پہلے مشورہ ضروری ہوتا ہے اور پھر بزرگوں کی باتیں تو بڑی کارآمد ہوتی ہیں''

محسن میاں کی ماں نے خاموشی اختیار کی تھی۔ پھر ایک دن گھر میں نمبر دار بختیار دادا اور قدسیہ دادی کو دعوت دی گئی تھی۔ دونوں پورے گاوں میں عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ مانے جاتے تھے۔ ان دونوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ اپنے طور پر محسن میاں کو یہ بات ذہن نشیں کرائیں کہ وہ دسویں جماعت سے آگے پڑھائی کا ارادہ ترک کر دیں۔ بختیار دادا نے محسن میاں کو بڑے پیار سے اپنے قریب بلایا تھا اور انھیں سمجھانے لگے تھے

''دیکھو بیٹے، اپنے ماں باپ کا کہنا مان لو۔ پڑھائی جاری رکھنے کی ضد نہ کرو۔ ہمارے اس علاقے سے آج تک جتنے بھی نوجوان پڑھائی کے سلسلے میں شہر کی طرف گئے وہ پھر واپس اس علاقے میں نہیں آئے، بلکہ وہیں بس گئے اور اگر سال میں کہیں ایک دو بار آتے بھی ہیں تو ان کے لیے ہمیں گھوڑے والے کو بھیجنا پڑتا ہے''

محسن میاں تادیر سر نیوڑھائے بختیار دادا کی باتیں سنتے رہے۔اسی دوران قدسیہ دادی با آواز بلند اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں کو جنبش دے دے کر کہنے لگی تھیں

''تم آج کے چھوکرے دیہات سے نکل کر شہر کی طرف جانے کے شوقین ہو۔ پڑھائی کے بہانے شہروں میں جا کر وہیں کسی اچھی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لیتے ہو اور ہماری دیہات کی سیدھی سادی اور گئو مزاج لڑکیاں کنوار پن میں اپنی زندگی بتا دیتی ہیں''

محسن میاں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا تھا

''میں ایسا نہیں کروں گا، اپنے ماں باپ، خاندان اور علاقے کا خیال رکھوں گا''

بختیار دادا اور قدسیہ دادی نے جھٹ سے اپنے بوڑھے کھردرے ہاتھ محسن میاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا

''لو بیٹا ہم سے وعدہ کرو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اسے عملی جامہ پہناؤ گے''

محسن میاں نے ہاتھ بڑھاتے ہو کہا تھا ''انشا اللہ تعالیٰ''

بختیار دادا اور قدسیہ دادی کے کہنے پر محسن میاں کو شہر میں پڑھائی کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا

پھر ایک دن محسن میاں اپنے والدین اور خاندان والوں سے رخصت لے کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ ماں اور بہنوں کا دل بھر آیا تھا، ان کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ان کی نگاہیں محسن میاں کے اوجھل ہونے تک ان کا تعاقب کرتی رہی تھیں۔

شہر میں آ کر اتفاقاً محسن میاں کی ملاقات ایک کارخانے دار سے ہو گئی تھی۔ کارخانے دار کو محسن میاں کی شکل وصورت، ان کی باتیں اور پھرتیلا پن دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔اس نے محسن میاں سے پوچھا تھا

''عزیزم......کہاں سے آئے ہو اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''جی۔ میں دیہات سے شہر میں گیارہویں کلاس میں داخلہ لینے آیا ہوں۔ مجھے اعلیٰ

تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے''محسن میاں نے جواب دیا تھا۔کارخانے دار نے کہا تھا

''اگر چاہو تو میرے پاس رہو۔ میں چاہتا ہوں تمہیں اپنے کارخانے میں پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک مزدوروں کی نگرانی پہ رکھوں''

مہینے میں تمہیں دو ہزار روپے ملیں گے۔کھانا اور رہائش مفت''

محسن میاں کو کارخانے دار کی باتیں سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ان کے چہرے پہ کھوئی ہوئی رونق لوٹ آئی تھی۔انھوں نے کارخانے دار کو کہا تھا

''جی میں آپ کی باتوں سے متفق ہوں''

محسن میاں کے لیے کارخانے دار مسیحا بن کے آیا تھا۔ ایمانداری اور حسن اخلاق سے انھوں نے کارخانے دار کا دل جیت لیا تھا۔وہ دن کو اسکول جاتے اور اس کے بعد رات کے دس بجے تک کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی نگرانی کرتے۔ گردش روز وشب میں ہفتے، مہینے اور سال بیت گئے۔محسن میاں کارخانے دار سے چھٹی لے کر کبھی کبھی اپنے گھر چلے جاتے تھے۔پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ محسن میاں اپنی محنت ولگن، علمی ذوق وشوق اور ذہانت کی بنیاد پہ پہلی پوزیشن میں گریجویشن کر گئے تھے۔ان کی قسمت کا ستارہ کچھ اس طرح چمکا تھا کہ ایک طرف انھوں نے گریجویشن کر دی تھی اور دوسری طرف کارخانے دار کی سفارش سے وہ ایکسائز محکمے میں ملازم بھرتی ہو گئے تھے۔ایک روز کارخانے دار اچانک کارخانے میں آیا تھا اور محسن میاں کو اپنی بیٹھک میں بلا کر کہنے لگا تھا

''محسن، اب تم سرکاری ملازم ہو گئے ہو۔ مجھے تمہاری بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے تمہاری مدد کی ہے۔اب اگر میں تمہاری ہی بہتری اور بھلائی کے لیے تمہیں کوئی کام سونپوں تو کیا میرا کام کرو گے؟''

محسن میاں نے اپنے آپ کو کارخانے دار کے احسانات کے بوجھ تلے دبتا ہوا محسوس کیا تھا۔انھوں نے ایک وفادار خادم کی طرح جواب دیا تھا

''میرے آقا آپ کا جو بھی حکم ہو۔ میرا سر تسلیم خم ہے۔ آپ حکم کیجئے''

کارخانے دار نے کہا تھا ''محسن --- میں تمہاری شادی اپنے رشتہ دار کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے کروانا چاہتا ہوں۔ تا کہ تم شہری زندگی میں ایک مہذب شہری بن کر رہو۔ بولو اس بارے میں تم کیا کہنا چاہو گے؟''

محسن میاں کی زبان لمحہ بھر کے لیے سن سی ہوگئی تھی، انھیں فوراً اپنے والدین یاد آئے تھے۔ بختیار دادا اور قدسیہ دادی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا تھا۔ سب کچھ یاد آنے کے باوجود کارخانے دار کے بھاری بھرکم وجود اور رعب دار شخصیت کے سامنے وقتی طور پر سب کچھ بھول گئے تھے اور بالآخر کسی تاخیر کے کہنے لگے تھے

''محترم المقام، میں آپ کی مرضی کے مطابق شادی کرنے کے لیے تیار ہوں''

کارخانے دار خوش ہوگیا تھا۔ اسے محسن میاں سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ فوراً اس کی بات مان جائیں گے۔ محسن میاں کے والدین اور خاندان والوں کو جب یہ پتا چلا کہ محسن میاں شہر میں کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کا پروگرام بنا چکے ہیں، تو وہ بہت مایوس ہو گئے تھے، بختیار دادا اور قدسیہ دادی کو کوسنے لگے تھے۔ محسن میاں کو اس بات کا احساس تھا کہ والدین کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔ وہ گھر آ کر سب سے پہلے ماں کے قدموں پہ سر رکھ کے رو اٹھے تھے۔ ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے تھے۔ پھر ماں نے ان سے بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا تھا

''ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم گاوں کے دوسرے لڑکوں کی طرح شہر میں کسی پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کا پروگرام بناؤ گے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو اپنا خون پلا کر جوان کرتے ہیں اور پھر جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو ماں باپ کو بھول جاتے ہیں''

محسن میاں نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا

''اماں...... اللہ نے تو دنیا کے ہر لڑکے اور لڑکی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی پسند کی

لڑکی،لڑکے سے شادی کریں۔اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے“

ماں نے یہ کہہ کے خاموشی اختیار کی تھی

”کیا گاؤں میں لڑکیاں نہیں رہی تھیں“

محسن میاں کے والد صاحب ان سے بہت زیادہ نارض تھے۔وہ اپنے بیٹے کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے تھے،مگر اس کے باوجود محسن میاں ان کے پاس گئے تھے۔جونہی انھوں نے سلام کی تھی تو والد صاحب نے منہ پھیر لیا تھا۔جس طرف وہ منہ پھیر لیتے محسن میاں اسی طرف ان کو سلام کرتے۔جب ایک دو بار ایسا ہی کیا تو والد صاحب ہنس پڑے تھے۔اور پھر کہنے لگے تھے

”تم جیسے نافرمان بیٹے کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے“

والد صاحب کے اس تذلیل آمیز جملے کے باوجود محسن میاں کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ والد صاحب بالآخر ایک دن شفقت پدری سے مغلوب ہوجائیں گے۔

گھر سے شہر واپس آنے کے بعد محسن میاں کی ملاقات ایک دن کارخانے دار سے ہوئی تھی۔علیک سلیک کے بعد کارخانے دار نے آہستہ سے اپنے پرس سے پاسپورٹ سائز کا ایک فوٹو نکالا تھا اور محسن میاں کو دکھاتے ہوئے کہنے لگا تھا

”محسن......یہ ہے وہ لڑکی جو تمہاری زندگی میں تمہاری بیوی بن کے آرہی ہے۔ اس کا نام نور جہاں ہے“

محسن میاں لمحہ بھر تک اپنی منگیتر کی تصویر دیکھتے رہ گئے تھے۔پھر کارخانے دار نے مسکراتے ہوئے محسن میاں سے پوچھا تھا

”لڑکی دیکھنے میں اچھی ہے نا؟“

محسن میاں نے جواب دیا تھا

”جی ہاں بہت اچھی ہے“

کارخانے دار نے کہا تھا اب مسلہ یہ ہے کہ لڑکی والے اس بات پہ اصرار کر رہے ہیں کہ شادی شہر میں ہوگی، دوسری بات یہ کہ ہماری لڑکی شہر ہی میں رہے گی گاؤں میں نہیں جائے گی۔ محسن، کیا تمہیں یہ باتیں منظور ہیں؟''

محسن میاں نے کہا تھا ''جی ہاں منظور ہیں''

ساون کے مہینے میں محسن میاں کی نورجہاں سے شادی ہوگئی تھی۔ والدین اور خاندان کے کچھ ہی لوگ ان کی شادی میں شریک ہوئے تھے۔ نکاح خوانی سے پہلے نکاح خواں نے ازدواجی زندگی کے حقوق و فرائض سمجھائے تھے اور پھر نکاح نامہ پہ دستخط کروائے تھے گویا یہ اس بات کا تصدیق نامہ تھا کہ حقوق الزوجین بحق میاں بیوی محفوظ۔

ازدواجی زندگی اختیار کرنے کے بعد محسن میاں کی زندگی میں بہار سی آ گئی تھی۔ ان کی روح کو چین اور دل و دماغ میں خوشیوں کی برات سی اتر آئی تھی لیکن بعد میں جب انھیں یہ پتا چلا کہ ازدواجی زندگی ذمہ داریوں، رشتہ داریوں اور رفیقۂ حیات کی ناز برداریوں کا نام ہے، تو تب انھیں اپنا آپ اس درخت کی مانند معلوم ہونے لگا تھا جو تند و تیز ہواؤں کی زد میں آتا ہے تو اس کی شاخیں آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگتی ہیں۔ ایک برس کے چار موسموں کا لطف تو وہ اٹھا چکے تھے لیکن پیار کا یہ پانچواں موسم انھیں حیرت زدہ کیے ہوئے تھا۔ گردش ایام میں وہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے باپ بن چکے تھے۔ ان کے ہر سکھ دکھ میں شریک رہنے والی ان کی رفیقۂ حیات نور جہاں خوب صورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی۔ محسن میاں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب خیال کرتے تھے کہ انھیں نور جہاں جیسی سلیقہ شعار، خوش مزاج، تعلیم یافتہ اور ریشمی دل و دماغ رکھنے والی بیوی نصیب ہوئی ہے۔

آج محسن میاں جب اپنے مکان کی چوتھی منزل پہ بیٹھے اپنے بچپن، لڑکپن، جوانی اور گذشتہ آٹھائیس سالہ ازدواجی زندگی پہ غور و فکر کر رہے تھے تو اچانک ان کی چھوٹی بیٹی ذرین آئی اور ان سے کہنے لگی

''پاپا......مماں کہہ رہی ہیں کہ پانچویں منزل کا پروگرام بنائیے۔آپ کو دو سال کے بعد ریٹائر ہو جانا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر کھولنا ہے''

''بیٹی---مماں سے کہیئے کہ پاپا کہہ رہے ہیں مجھے ایک دن گھر جانا ہے''

''پاپا...... یہ آپ کیا کہہ رہے، مجھے ایک دن گھر جانا ہے؟''

''ہاں آپ جایئے اور مماں سے کہہ دیجئے''

ذریں نے جب محسن میاں کی بات نور جہاں کو سنائی تو وہ حیران رہ گئی۔ وہ فوراً رسوئی کا سارا کام چھوڑ کر محسن میاں کے پاس آئی اور ان سے پوچھنے لگی

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ مجھے ایک دن گھر جانا ہے۔کیسا گھر؟ کون سا گھر؟''

نور جہاں کے دل و دماغ میں شک کی سوئی گھومنا شروع ہو گئی اور ماتھے پہ شکنیں سی ابھرنے لگیں کہ اسی دوران جامع مسجد کے امام صاحب نے مسجد کی مائیک سے یہ اعلان کر دیا

''برادان اسلام۔ ہمارے شہر کے مشہور و معروف ماہر امراض دل و دماغ ڈاکٹر تاج الدین امریکہ کے سب سے بڑے اسپتال میں انتقال کر گئے ہیں، وہ دو ماہ سے بیمار تھے۔ان کا جسد خاکی ہوائی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر میں پہنچایا گیا ہے۔اس لیے یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ان کی نماز جنازہ پورے ایک بجے شاہی قبرستان میں پڑھی جائے گی''۔

....

انتظار مرگ

سلام دین کی عمر پچھتر برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ بیوی کو دنیا سے رخصت ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے، بیٹی نہیں ہے۔ بیوی کی دائمی جدائی کا غم کبھی کبھی انھیں کسی گوشئہ تنہائی میں جا کر آنسو بہانے اور آہیں بھرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مگر اسکے باوجود وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور ہر کسی کو خیر و شر کا درس دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیٹے کا نام جلال دین اور بہو کا نام رفعت ہے۔ دونوں مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ بیٹے سے زیادہ بہو تیز طرار اور منہ پھٹ ہے۔ وہ گھر ہی میں بیوٹی پارلر کا کام کرتی ہے، جبکہ اس کا شوہر شہر کے ایک رئیس آدمی کے پولٹری فارم میں کام کرتا ہے۔ دونوں آدھی آدھی رات تک ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پہ عجیب وغریب قسم کی مخلوقات دیکھنے کے عادی ہیں۔ سلام دین کے بوڑھے وجود میں اس وقت غم وغصے کی چھری سی چل جاتی ہے جب وہ رات یا دن کو سوئے ہوتے ہیں تو ٹیلی ویژن کی اونچی آواز ان کی نیند میں خلل ڈالتی ہے۔ تب وہ بستر سے جھنجھلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور گھر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ آج بھی جب رات کے دس بجے کے قریب ٹیلی ویژن کی اونچی آواز نے ان کی نیند میں خلل ڈالا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بہو بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہنے لگے

''خدا کا خوف کرو، تمھیں موت یاد نہیں ہے کیا؟ اس شیطان کو اٹھاؤ اور باہر پھینک دو۔ دن کو چین نہ رات کو آرام نصیب ہے مجھے''

بڑھاپے کی عمر میں بھی سلام دین کو اپنے گھر آنگن کی ہر چیز کا پورا خیال رہتا ہے۔ زبان پہ اللہ کا ذکر اور دل میں آخرت کی فکر کے ساتھ ساتھ وہ جب کسی بھی چیز یا کام میں بے

ضابطگی دیکھتے ہیں تو تب وہ ڈانٹ ڈپٹ پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ مانا کہ بڑھاپے میں انسان کے حواس خمسہ کمزور پڑ جاتے ہیں اور مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہوتا ہے لیکن سلام دین مستقل مزاج آدمی ہیں۔ کھری کھوٹی منہ پہ سنا دیتے ہیں۔ سلام دین کی ٹوکا ٹوکی سے اب ان کی بہو اور بیٹا تنگ آ چکے ہیں۔ ایک روز ان کی بہو نے اپنے شوہر سے کہا

''سسر جی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان سے کوئی بھی کام نہیں ہوتا ہے۔ بس ہر وقت تسبیح پھیرتے رہتے ہیں اور مرنے کے بعد کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ انھوں تو ہمارا جینا ہی حرام کر دیا ہے۔ رات کو بیچ بیچ میں کھانستے رہتے ہیں۔ میں آپ کو کئی دن سے کہہ رہی ہوں کہ انھیں کھانسی کی دوائی لا کر دیجئے تا کہ ان کی کھانسی ہماری نیند میں خلل نہ ڈالے''

جلال دین نے بیوی کو جواب دیا

''اری پگلی۔ ابا کی کھانسی کا سب سے بڑا فائدہ ہمیں یہ ہے کہ ان کی کھانسی سن کر ہمارے گھر میں چور داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم تو ہے کہ آجکل چوریاں ہو رہی ہیں اور تم کہہ رہی ہو کھانسی کی دوائی لا کر دو''

جلال دین کی بیوی کے ماتھے پہ درجن بھر شکنیں ابھر آئیں۔ اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا

''سسر جی نے ہم پہ ٹیلی ویژن نہ دیکھنے کی پابندی عائد کر دی ہے۔ اس لیے خدا اگر انھیں اس دنیا سے اٹھا لے تو بہتر ہے۔ بوڑھے کسی بھی کام کے نہیں ہوتے ہیں۔ بس ایک بے کار سی شے کی مانند ہوتے ہیں''

جلال دین نے بڑی بے غیرتی سے بیوی کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا

''ہاں رفعت تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ابا کی حیثیت اب اس گھر میں کباڑ کی سی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ اگر وہ اللہ کو پیارے ہو جائیں تو ہم آرام سے گھر میں ٹیلی ویژن دیکھ سکیں گے''

جلال دین کی باتیں سن کراس کی بیوی کے چہرے پہ نکھار سا آ گیا۔سلام دین کا پانچ سالہ پوتا عدنان بڑے دھیان سے اپنے والدین کی باتیں سن رہا تھا۔وہ اٹھا اور سلام دین کے کمرے میں چلا گیا۔وہ عصر نماز پڑھنے کے بعد ذکر اللہ میں مصروف تھے۔عدنان نے آہستہ سے اپنے دادا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگا

''دادا جی......دادا جی......آپ کب مریں گے؟''

سلام دین نے اپنے لاڈلے پوتے کو گلے لگایا۔اس کے سر پہ اپنا دست شفقت پھیرا، ماتھے پہ بوسہ دیا اور پھر اسے کہنے لگے

''میرے لعل کے لعل، میرے جگر پارے۔موت کا کیا پتا کب آئے۔مگر آج آپ مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

عدنان نے کہا

''دادا جی، ممی ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ جب دادا جی مر جائیں گے تو اس کے بعد ہم آرام سے گھر میں ٹیلی ویژن دیکھیں گے''

عدنان کی باتیں سن کر سلام دین کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ چکراتے ہوئے سجدے کی حالت میں گر پڑے ہمیشہ کے لیے سجدے سے سر نہ اٹھانے کے لیے۔ عدنان نے جب اپنے دادا کو اس حالت میں دیکھا تو چیختے ہوئے کہنے لگا

''دادا جی کو کچھ ہو گیا............دادا جی کو کچھ ہو گیا'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے ممی ڈیڈی کی طرف دوڑ پڑا۔

....

واپسی

دیارام کو اپنے گہرے دوست رمیش بھاردواج کی شادی میں اس بات کی بہت خوشی ہوئی تھی کہ بھاردواج نے جہیز لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے اس غیر متوقع فیصلے پہ لڑکی والے حیران رہ گئے تھے اور رمیش بھاردواج کے والدین کے چہروں پہ مایوسی چھا گئی تھی۔

رمیش بھاردواج نے لڑکی والوں کو سب کے سامنے کہہ دیا تھا

''مجھے جہیز نہیں چاہیئے ۔میں آپ کی لڑکی سے شادی کر رہا ہوں، جہیز سے نہیں''

دیارام کو اپنے دوست کی شادی پہ بڑی تھکان اور کوفت سی محسوس ہوئی تھی کیونکہ رات بھر شادی کا ماحول چلتا رہا تھا۔ اس نے دلہے اور دلہن کو پنڈت جی کے منتروں کے اچارن کے مطابق ازدواجی رشتے میں بندھتا دیکھا تھا۔ تب اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ شادی مریاداوں کا انت ہے۔

رمیش بھاردواج کی شادی کو ابھی پندرہ ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن دیارام کو یہ مایوس کن خبر سننے کو ملی کہ اسکے دوست کا ایک گاڑی حادثے میں انتقال ہو گیا۔ دیارام وقتی طور پر حواس باختہ سا ہو گیا۔ اس نے اپنے دوست کی دائمی جدائی کے غم میں دیر تک آنسو بہائے تھے۔ پھر وہ فوراً اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ رمیش بھاردواج کے گھر پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی کہ جس کے ہاتھوں میں مہندی کی رنگت ابھی باقی تھی اور دلہن روپ نے ماتمی صورت اختیار کر لی تھی، وہ اپنے جیون ساتھی کی لاش پہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے رمیش بھاردواج کی ارتھی اٹھی تھی۔ موت نے زندگی پہ قابو پالیا

تھا۔ دیارام نے اپنی آنکھوں کے سامنے رمیش بھاردواج کی لاش کو چتا میں جلتا ہوا دیکھا تھا۔ اس کا وجود یہ بھیانک منظر دیکھ کے کانپ گیا تھا۔ پھر وہ دیر تک یہ بات سوچ کے رہ گیا تھا کہ آخر یہ انسان کہاں سے اس روئے زمین پہ آتا ہے اور پھر کہاں چلا جاتا ہے؟ شمشان گھاٹ سے کچھ دوری پر نچلی جانب ایک اور لاش جل رہی تھی۔ دیارام کی نظر اچانک ایک بوڈ پہ پڑی اس پہ لکھا تھا؟ یہ دلتوں کا شمشان گھاٹ ہے؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ جیتے جی یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی آدمی نے یہ نفرت وتعصب، اونچ نیچ کی دیواریں آخر کس بنیاد پہ کھڑی کی ہیں؟

ایک روز دیارام کی بہن نیلم کماری نے پانی سے بھری گگریا اپنے سر سے اتاری اور گھڑونچی پر رکھی، پھر ایک طرف بیٹھ گئی اور پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔ اس کا باپ درباری لال، ماں رکمنی، بہو جھانجھری، نیلم کا اکلوتا بھائی دیارام اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے گل گوتھنے سے بیٹے نیلم کماری کے آس پاس آ کے حیرت زدہ سے کھڑے ہو گئے۔ ماں نے پوچھا

''بٹی کاہے کو روت ہے۔ کیا ہوا؟''

نیلم نے کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ لگتا تھا اس کی ہچکی بندھ جائے گی۔ باپ نے بھی رونے کی وجہ پوچھی تو وہ نہیں بولی۔ پھر اس نے جھڑک کر کہا

''بولتی کیوں نہیں ہے کیا ہوا؟ ماروں زور سے جھاپڑ''

تب نیلم کماری سسکیاں لیتی ہوئی بولی

'''' کہاروں کے محلے کی دو عورتوں نے باولی پہ میری گگریا پٹک دی، بولیں تو پہلے پانی نہیں بھرے گی۔ تم اچھوت، شودر لوگ ہو۔ پہلے ہم پانی بھریں گی''

رکمنی نے کہا

''اے بھگوان اس دور میں بھی چھوت چھات۔ بھاڑ میں جائیں ایسے لوگ، تو

چپ کر''

نیلم کماری کے بھائی دیارام کا خون کھول اٹھا، تب اس نے کہا

''میرا جی چاہتا ہے کہ تبرا اٹھاؤں اور ان دلالنوں کو کاٹ ماروں۔
آخر کیا سمجھ رکھا ہے ان لوگوں نے اپنے آپ کو۔ گھور پاپی ہیں
مگر پھر بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں''

درباری لال نے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا

''ابے دھیرج سے کام لے بیٹا، جوش میں ہوش کھونا اچھی بات نہیں ہے۔ بھگوان دیکھ رہا ہے۔ بات رفع دفع کردو''

دیارام نے کہا

''بات رفع دفع کرنے کی نہیں ہے بابا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا سیکھیے''

شہر سے تقریباً چار کیلومیٹر دور دلتوں کے کچھ گھر آباد تھے۔ دیارام کا تعلق دلت طبقے سے تھا۔ وہ سماجیات میں ایم اے کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد محکمۂ خوراک رسانی میں انسپکٹر کی پوسٹ پہ تعینات ہوگیا تھا۔ اس کا باپ درباری لال خود زمین کا سینہ چیر کے گنے کی کھیتی اگایا کرتا تھا۔ درباری لال کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں تھیں۔ دو کی شادی ہو چکی تھی۔ نیلم کماری سب سے چھوٹی تھی۔ بارہویں کلاس کا امتحان دے چکی تھی۔

دیارام کافی ذہین تھا اور حساس بھی۔ بھونڈے رسم و رواج سے اسے سخت نفرت تھی۔ لیکن آج بہن کے آنسوؤں نے اس کے دل میں آگ سی لگا دی تھی۔ ذات پات، چھوت چھات، رنگ و نسل، بھید بھاؤ، علاقائیت اور فرقہ پرستی کو وہ ملک و قوم کے لیے ناسور سمجھتا تھا۔ وہ آدمیت سے زیادہ انسانیت کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ جب عید کے دن عیدگاہ میں امام صاحب کے پیچھے مسلمانوں کو نماز پڑھتے یا نماز جنازہ میں صفوں میں ایک ساتھ کھڑے دیکھتا تو اسے بہت اچھا لگتا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ اسلام قبول کرے مگر پھر نہ جانے

وہ کیا سوچ کے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں کھو جاتا۔ لیکن آج جب اس نے اپنی بہن کے بہتے ہوئے آنسو دیکھے تو اس نے یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ نہ صرف خود بلکہ بمعہ اہل وعیال اسلام قبول کرے گا۔ اسی نیک ارادے کے ساتھ دیارام، مفتی نورالعین کے پاس چلا گیا۔ مفتی صاحب پورے علاقے میں نہایت باوقار، نیک سیرت اور روحانی امراض کے معالج کے طور پر مشہور تھے۔ دور دور سے لوگ ان کے پاس اپنا اپنا درد لے کر آتے تھے۔ خاص طور پر ویروارکوان کے گھر پر لوگوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔

جب دیارام مفتی صاحب کے گھر پر پہنچا تو اسے ایک الگ کمرے میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ کچھ وقت کے بعد نوکر چائے پانی لے کر آ گیا۔ چائے پیتے ہوئے دیارام نے نوکر سے کہا

''میں مفتی صاحب سے ایک خاص مسئلے کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے اندر بلا لیں''

نوکر نے کہا

''جی میں ان سے کہتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے وہ مفتی صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد مفتی صاحب خود ہی دیارام کے پاس آئے

دیارام فوراً کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے آداب بجالاتے ہوئے مفتی صاحب کے پاؤں کو ہاتھ لگانا چاہا لیکن مفتی صاحب نے اسے روک لیا اور کہنے لگے

''ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' مفتی صاحب نے دیارام کو گلے لگایا۔ پھر اسے پوچھنے لگے

''بتایئے میرے لائق کیا حکم ہے؟''

دیارام بولا

''مفتی صاحب حکم نہیں، عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں''

مفتی صاحب حیران رہ گئے۔انھوں نے دیارام سے پوچھا

''آپ کیوں اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں۔؟''

''مفتی صاحب اس لیے کہ اسلام میں مجھے آفاقیت، صداقت اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ ہمارا سماج چونکہ فرقوں میں بٹ چکا ہے۔ مجھے فرقہ پرستی اور فرقہ بندی پسند نہیں ہے۔ مفتی صاحب میں آپ سے یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مسلم سماج میں بھی اسلام کے نام پہ فرقہ بندی ہے یا نہیں؟''

مفتی صاحب کے وجود میں صداقت پسند دل ودماغ موجود تھا۔ پاسداری اور پردہ داری ان کے وجود کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ان سے رہا نہیں گیا۔انھوں نے کہا

''سنیے......ہمارے یہاں بھی اسلام کے نام پہ مختلف فرقے وجود میں آچکے ہیں۔مثلاً سنی،شعیہ، مالکی، حنبلی، شافعی، غیر مقلد، دیو بندی، بریلوی''

مفتی صاحب کی باتیں سن کر دیارام مایوس ہوگیا۔اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ لمحہ بھر تک اس نے خاموشی کے ساتھ فرش پر دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا

''اچھا مفتی صاحب، میں چلتا ہوں''

مفتی صاحب نے پوچھا

''ارے آپ تو اسلام قبول کرنے آئے تھے۔ کس سوچ میں پڑ گئے۔فوراً واپس چل پڑے؟''

دیارام نے جواب دیا

''مفتی صاحب، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ میں کون سا مسلمان بنوں۔ سنی بنوں، شعیہ بنوں، مالکی بنوں، حنبلی بنوں، شافعی بنوں، غیر مقلد بنوں، دیو بندی بنوں، بریلوی بنوں''

یہ کہتے ہوئے دیارام کمرے سے باہر آیا اور تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے کافی

آ گے نکل گیا۔ مفتی صاحب نے اسے پیچھے سے آواز دی

''او میرے بھائی، ٹھہر جایئے، آپ پڑھ لیجیے کلمہ طیبہ لا الہ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہاں تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ فرقوں میں نہ پڑیں''

لیکن دیکھتے دیکھتے دیارام، مفتی صاحب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

....

حاضر جواب

پکار ناتھ ایک ہائر اسکینڈری اسکول میں علم حیاتیات (zoology) کے لیکچرر ہیں۔ ہر وقت ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں۔ بہت زیادہ لالچی ہیں، کسی سے اگر دوستی کریں گے تو پہلے یہ دیکھیں گے کہ مجھے اس شخص سے کتنا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے غرضیکہ نفع پہ نظر رکھتے ہیں۔ ڈیوٹی کو غلامی سمجھتے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی اسکول آتے ہیں۔ اسکول میں بچّوں کو کم ہی پڑھاتے ہیں کیونکہ وہ گھر میں ٹیوشن پڑھانے کے عادی ہیں۔ انھوں نے پیتل اور تانبے کے برتنوں کی بھی دکان رکھی ہے، کسی کی بات نہیں سنتے، بس اپنی ہی سناتے رہتے ہیں۔ ضدی قسم کے آدمی ہیں۔ اسکول کے اندر اور باہر لوگ انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ کھانے پینے والے آدمی ہیں۔ انھیں معمار قوم کے بجائے اگر مسمار قوم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جولائی کا مہینہ تھا، گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ پکار ناتھ اسکول جا رہے تھے کہ اچانک قومی شاہراہ پہ چھوٹی بڑی گاڑیاں رک گئیں۔ وہ منی بس سے اترے اور باقی لوگوں کی طرح سڑک پہ پیدل چلنے لگے۔ اسکول تقریباً دو کیلومیٹر کی دوری پر تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں وہ بار بار پسینہ پونچھتے رہے۔ گرمی اور پسینے سے ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اسکول تک پہنچتے پہنچتے وہ بہت تھک گئے۔ انھوں نے حاضری رجسٹر پہ دستخط کیے اور بارہویں کلاس میں پڑھانے چلے گئے۔ طلبہ احتراماً ان کے لیے کھڑے ہوگئے اور پھر ان کے کہنے پر بیٹھ گئے۔ کلاس روم میں بجلی غائب تھی۔ پکار ناتھ نے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنی شرٹ کھولی اور کرسی کی پشت پہ رکھ دی۔ اسکول لائبریری سے اخبار منگوائے اور دو لڑکوں کو اپنے دائیں بائیں اخبار جھلانے کے لیے کھڑا کر دیا اور دو کو اپنی ٹانگیں دابنے پہ لگا دیا۔ ابھی تقریباً پندرہ ہی منٹ

ہوئے تھے کہ اچانک چیف ایجوکیشن آفیسر صاحب اسکول میں آ گئے۔ وہ پرنسپل صاحب کے آفس میں جانے کے بجائے سیدھے کلاسوں کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ جونہی بارہویں کلاس روم کے دروازے پہ پہنچے تو پکار ناتھ نے انھیں دیکھ لیا اور زور زور سے طلبہ کو سمجھانے لگے

''پیارے طالب علمو۔ اب آپ کو سمجھ آئی کہ آکسیجن کیا چیز ہے اور بلڈ سرکولیشن کیا ہوتی ہے۔ آپ کو ہم نے یہ بھی سمجھایا کہ ہمارے پارٹس آف باڈی کیا کام کرتے ہیں۔ کیا آپ کو میری باتیں سمجھ میں آئیں''؟

سب طلبہ نے بیک آواز کہا

''جی سر، سمجھ آئی''

چیف ایجوکیشن آفیسر صاحب لحہ بھر کے لیے کھڑے رہے اور پھر کلاس روم میں تشریف فرما ہوئے۔ پکار ناتھ فوراً کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر آداب بجا لائے۔ چیف ایجوکیشن آفیسر صاحب انھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے پکار ناتھ سے پوچھا

''آپ کا نام''؟

''سر، ناچیز کو پکار ناتھ کہتے ہیں''

''آپ کس سبجیکٹ کے لیکچرر ہیں''؟

''سر، میں زولوجی پڑھاتا ہوں اور میری یہ کوشش رہتی ہے کہ تھیوری کے ساتھ ساتھ اسٹوڈینٹس کو پریکٹیکل کروایا جائے تا کہ انھیں یہ پتا چلے کہ کہاں کیا ہے''

چیف ایجوکیشن آفیسر کے چہرے پہ خوشی کے آثار دکھنے لگے، ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا

''ویری گڈ، ہمیں ایسے ہی لیکچررز کی ضرورت ہے جو پریکٹیکل پر زیادہ زور دیں، یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ خیالی قصوں کا زمانہ نہیں ہے'' پھر وہ پرنسپل صاحب کی طرف

مخاطب ہوئے اور انھیں کہنے لگے

''مجھ سے محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ آفیسران نے بیسٹ ٹیچر ایوارڈ فائل مانگی ہے۔ میں پکارنا تھ صاحب کا نام اس کے لیے مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ دو دن کے اندر ان کی فائل میرے آفس میں پہنچا دیں تا کہ میں اپنی منظوری کے ساتھ اسے آگے بھیج دوں''

....

انتقام

نویدالرحمٰن اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم ہیں۔ تنخواہ اچھی ہونے کے علاوہ باہر کی بھی آمدنی ہے۔ ان کی بیوی مہرافروز ایک سرکاری ہائی اسکول میں معلّمہ ہیں۔ دونوں خوشحال ہیں مگر دل کے چھوٹے ہیں۔ انھیں گھر میں دیسی مرغیوں کو پالنے کا بہت شوق ہے کیونکہ دیسی مرغی کا انڈا انگریزی نسل کی مرغی کے انڈے سے زیادہ طاقتور اور قیمتی ہوتا ہے۔ دو ہفتوں میں وہ تقریباً پانچ سو روپے کے انڈے بیچتے ہیں۔ ایک روز ایک مرغی ڈربے سے باہر نکل آئی اور گھر کے آنگن میں ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگی۔ اسی اثنا میں مرغی نے آسمان میں ایک چیل کو منڈلاتے ہوئے دیکھا تو اس نے اسے موت کا فرشتہ سمجھا۔ وہ ڈری سہمی سی زور زور سے کٹ کٹ کرتی رہی، پھر اس نے اڑان بھری اور پڑوس کے ایک گھر میں ایک جگہ چھپ گئی۔ پڑوسن نے اسے مالِ غنیمت سمجھ کر ایک پنجرے میں قید کر دیا۔ ادھر نویدالرحمٰن اور مہرافروز کو مرغی کی گمشدگی کی فکر سوار ہوئی۔ چنانچہ دونوں مرغی کی تلاش میں گھر سے باہر اسے تلاشنے لگے۔ محلے میں ادھر ادھر ڈھونڈنے اور پوچھنے کے بعد جب انھیں مرغی کا کوئی پتا نہیں چلا تو وہ مایوسی کے عالم میں واپس گھر لوٹنے لگے۔ اچانک مہرافروز کی نظر پڑوسن کے صحن میں رکھے پنجرے پر پڑی اور اپنی مرغی کو اس میں فوراً پہچان لیا۔ مرغی نے پنجرے میں دو انڈے بھی دیئے تھے۔ دونوں کا دل مرغی اور انڈوں کو دیکھ کے خوش ہوا۔ وہ دونوں پڑوسن کے گھر میں داخل ہوئے۔ مہرافروز نے مرغی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعتراضاً پڑوسن کو کہا

''یہ مرغی ہماری ہے۔ آپ نے اسے کیوں قید کر رکھا ہے؟ آپ کا تو یہ فرض بنتا تھا کہ آپ ہمیں اطلاع کرتے کہ آپ کی مرغی ہمارے آنگن میں آئی ہے، اسے لے جایئے۔

اس لیے یہ مرغی اور اسکے انڈے ہمارے ہیں"

پڑوسن مطلوقہ تھی۔ نہایت تیز طرار، چار چشمی، چار سو بیسی کے تمام گُر سے واقف، تھانے کچہری کے تمام داؤ پیچ وہ جانتی تھی۔ پوری چھنال۔ اس نے پہلے تو مہر افروز کے سراپے پہ نفرت وحقارت سے نظریں دوڑائیں اور پھر بڑے ترش لہجے میں کہنے لگی۔

'مرغی اب تیری نہیں میری ہے، کیونکہ یہ خود یہاں اُڑ کے آئی ہے۔ میں اسے بلانے نہیں گئی ہوں۔ میرے گھر میں آئی ہے۔ اس لیے میری ہے۔ تم اپنا راستہ ناپو، مرغی اور اسکے انڈے تمھیں نہیں ملیں گے"

مہر افروز نے پڑوسن کی باتوں کا جواب نہیں دیا۔ وہ گئی اور پنجرے سے مرغی اور انڈے اٹھانے لگی۔ پڑوسن بھی اس پر جھپٹ پڑی اور مرغی اور انڈے اس سے چھڑانے لگی۔ قریب تھا کہ مرغی چھینا جھپٹی میں حرام ہو جاتی۔ لیکن فہر افروز نے فوراً یہ ہوشیاری برتی کہ اس نے مرغی اور انڈے اپنے شوہر کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ دونوں عورتوں نے پہلے تو ایک دوسرے کے ماں باپ کو گالی گلوچ میں یاد کیا اور پھر دھکا مکی پہ اتر آئیں۔ محلے کے لوگ ان عورتوں کا شور سن کر اپنے اپنے گھر کی چھتوں پہ نکل آئے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ان عورتوں کی لڑائی ایک دلچسپ سین بن گئی۔ لیکن جلدی ہی کچھ سنجیدہ لوگوں نے آگے بڑھ کر ان عورتوں کو سر پھٹول ہونے سے بچالیا۔ مہر افروز کے شوہر نے اپنی بیوی کی بانہہ پکڑی اور اسے پڑوسن کے آنگن سے باہر لے گیا۔ مہر افروز کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے محلے کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"دیکھئے اس عورت کو......ایک تو چوری اور اس پہ سینہ زوری" پڑوسن نے بھی اسے ایک بھدی سی گالی دی اور چند لمحوں کے بعد ماحول ٹھنڈا پڑ گیا۔

نوید الرحمٰن کی چھوٹی چھوٹی تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹا نہیں تھا۔ مہر افروز اب کے برس بھی امید سے تھی۔ ایک روز وہ دونوں سردی کے موسم میں اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھے

دھوپ تاپ رہے تھے کہ اسی دوران نویدالرحمٰن کو یہ تشویش سوار ہوئی کہ اب کی بار بھی اگر مہر افروز نے بیٹی ہی کو جنم دیا تو میرے نحیف کندھے چار بیٹیوں کا بار گراں نہیں اٹھا پائیں گے۔اس لیے انھوں نے متفکر لہجے میں اپنی بیوی کو بٹھا دیا انھوں نے کہا

''بیٹے کی چاہت میں ہم تین بیٹیوں کے والدین بن چکے ہیں۔ان کی بہتر تعلیم وتربیت،ان کی دیکھ ریکھ،ان کی ملازمت اور پھر ان کے بہتر گھر اور بر کی جستجو،اوپر سے عصری سماج کی خباثت آمیز ذہنیت۔ جب میں ان تمام مسائل ومشکلات پر دھیان دیتا ہوں تو خیالوں ہی خیالوں میں میری نگاہوں کے سامنے مستقبل کی ایک سیاہ دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے میرا تمھیں یہ مشورہ ہے کہ تم اپنی سونوگرافی کروالو۔اگر ہوگا بچہ تو پھر خوشی کی بات ہوگی اور اگر بچی کے آثار نظر آئے تو پھول چوک میں ڈاکٹر دیوراج کا مشہور کلینک ہے،وہاں رات کو بارہ بجے کے بعد شکم مادر میں پل رہی بچیوں کا صفایا کیا جاتا ہے۔لہذا کل ہم یہاں سے رات کو گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر دیوراج کے کلینک چلے جائیں گے''

مہر افروز نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔نویدالرحمٰن کی باتیں سن کر اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے اس کے شکم میں پل رہی تین ماہ کی بچی اس سے زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو۔اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا

''میرا دل نہیں چاہتا کہ بچی ہونے کی صورت میں اس کا قتل کراوں۔ جہاں تین کو اللہ رزق دے رہا ہے وہاں چوتھی کو بھی وہ رزق دے گا۔اس لیے اللہ پہ بھروسہ رکھیے''

نویدالرحمٰن نے روکھے پن سے کہا

''مجبوری انسان سے سب کچھ کرواتی ہے۔تم میری باتوں پہ دھیان دو۔ سونوگرافی بہتر رہے گی۔اس لیے کل رات گیارہ بجے ہم کو ڈاکٹر دیوراج کے کلینک جانا ہی جانا ہے''

مہر افروز بادل ناخواستہ اپنے شوہر کی بات مان گئی۔ بزرگوں کا قول ہے کہ

دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ان دونوں کی پوری گفتگو پڑوسن سن رہی تھی۔اس نے ان کی تمام باتیں اپنے موبائل فون میں ریکارڈ کرلیں اور دوسرے دن اس نے پولیس اسٹیشن جا کر تھانیدار کو نویدالرحمٰن اور مہرافروز کی پلاننگ سے آگاہ کردیا۔تھانیدار نے اپنے ہمراہ دو سپاہیوں اور پڑوسن کو وقت مقررہ پر اپنی گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر دیوراج کے کلینک پر رات کے عین ساڑھے بارہ بجے چھاپہ مارا۔نویدالرحمٰن اور مہرافروز وہاں پہنچ چکے تھے۔سونوگرافی سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مہرافروز کے شکم میں بچی ہے۔اب وہ آپریشن تھیٹر میں جانے ہی والی تھی کہ پولیس پہنچ گئی اور سب سے پہلے ڈاکٹر دیوراج کو گرفتار کیا اور اسکے بعد نویدالرحمٰن اور مہرافروز کو اپنی تحویل میں لیا۔پڑوسن کو یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے آج اس کے دل میں انتقام کی آگ بجھ گئی ہو۔

....

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

عورت

رام دلاری اس دن خوشی کے مارے پھولے نہیں سمائی تھی جس دن اسے ایل ایل بی کے بعد ایل ایل ایم کی ڈگری حاصل ہوئی تھی۔ ایک متوسط گھرانے کی صاحبزادی کہ جس کے پتا جی ٹیلر ماسٹر اور ماتا جی آنگن واڑی ورکر کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ رام دلاری کی ایک ہی چھوٹی بہن تھی اوشا، بھائی کوئی نہیں تھا۔ اوشا بارہویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اوشا سے زیادہ رام دلاری خوبصورت تھی۔ لامثال حسن و جمال کی ملکہ۔ قانون پڑھتے پڑھتے اس کا دماغ قانونی اور دل انقلابی ہوگیا تھا۔ ایک روز کروڑ پتی بزنس مین کے بیٹے نے رام دلاری کو دیکھا تو دیر تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اجنبیت، اپنائیت میں بدلنے لگی۔ موبائل فون پہ پیار و محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ بزرگوں کی بزرگانہ باتیں اور بہترین خاندانی روائتیں دم توڑنے لگیں۔ کروڑ پتی بزنس مین کے بیٹے نے رام دلاری کو اپنی دھرم پتنی بنانے کے بہانے اسے چوری چھپے کئی تاریخی عمارتوں اور مختلف تفریح گاہوں میں گھمایا پھرایا۔ جب اس کا جی رام دلاری سے اوب گیا تو اس نے دھیرے دھیرے اس سے نظریں چرانا شروع کردیا۔ پھر جب ایک دن رام دلاری کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ بزنس مین کے بیٹے کی سگائی شہر کے ایک رئیس خاندان کی لڑکی سے ہوگئی ہے تو وہ ان عام ماڈرن لڑکیوں کی طرح بالکل نہیں روئی جو اوباش، آوارہ اور غیر مستقل مزاج لڑکوں کے فریب محبت میں آکر دھوکہ کھاتی ہیں اور پچھتاتی ہیں، البتہ لمحہ بھر کے لیے رام دلاری کی آنکھیں یہ جگر سوز خبر سن کر کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے دل میں مرد ذات سے نفرت کا شعلہ بھڑک اٹھا، تب اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ عورت ذات کا من بڑا چنچل اور تن کومل ہوتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ عورت اس دھرتی پہ ابتدائے آفرینش سے اب تک مظلوم، محکوم اور مرد ستم رسیدہ رہی ہے۔ اس جگر پارہ پارہ کر دینے والے صدمے نے رام دلاری کے دل میں مرد ذات سے نفرت کا زہر بھر دیا اور اس نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ وہ اپنے جیون میں کسی بھی مرد کو اپنا جیون ساتھی نہیں بنائے گی۔ اس نے یہ بھی ارادہ کیا کہ وہ عورتوں کی خوشحالی اور ترقی کے لیے کام کرے گی مزید یہ کہ ان پہ ہو رہے ظلم و زیادتی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے گی۔ چناں چہ اس نے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو خواتین کمیشن کی ممبر بننے کے لیے پیش کیا۔ اس نے خواتین کے بہت سے مسائل مثلاً طلاق، جہیز کی لعنت، اغوا، بہتر تعلیم سے محرومی، بھونڈے رسم و رواج، توہم پرستی کی بھینٹ چڑھتی عورتیں اور عیاش مردوں کے ان تمام استحصالی ہتھکنڈوں کا پتا لگانے کی کوشش کی جن کے باعث عورتیں یا تو خودکشی کرتی ہیں یا پھر مایوسی کی زندگی گزراتی ہیں۔

ایک روز خواتین کمیشن کے چیرمین صاحب نے رام دلاری کو اپنے آفس میں بلایا اور کہا

''ہمارے ملک میں خواتین عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ طلاق، اغوا اور خودکشی کی وارداتیں آئے دن ہمارے پڑھنے، سننے اور دیکھنے میں آتی ہیں۔ مزید یہ کہ جدید الیکٹرانک میڈیا نے عورت کو بطور نمائش ایک طرح کی عالمی منڈی میں لا کھڑا کیا ہے۔ جو روز افزوں ایک تشویشناک مسلہ بنتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم آپ سے یہ جاننا چاہیں گے کہ اس کے بنیادی اسباب و علل کیا ہیں۔ کیونکہ آپ ہماری نظر میں ایک سنجیدہ ماہر قانون دوشیزہ ہیں''

رام دلاری نے چیرمین کی باتیں بغور سنیں اور کہنے لگی

''سر...... آپ نے مجھ پہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈالی، میں اس سلسلے میں اپنا ذہن دوڑاتی ہوں، اور ایک تجربے کے تحت کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں''

چیرمین صاحب خوش ہو گئے، انھوں نے کہا

''ہمیں دو دن کے اندر اس مسلے کا حل چاہیئے''

رام دلاری نے اثبات میں سر ہلایا اور چیر مین صاحب کے آفس سے باہر نکل آئی۔ گھر پہنچ کر وہ سوچ میں گم رہی۔ سوچتے سوچتے بلآ خر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ فیس بک پہ اپنے دو طرح کے پوز ڈالے گی۔ ایک پوز اس کا جدید فیشن کے لباس میں ہوگا اور دوسرا نقاب پوش صورت میں۔ کہتے ہیں ''نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی'' رام دلاری پہ یہ ضرب المثل صادق آتی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تو تھی ہی لیکن جب اس نے بناو سنگھار کے بعد قد آدم آئینے کے سامنے اپنی آرائش وزیبائش کے تمام زاوئے درست کیے تو اس کی جمالیاتی حس جاگ اٹھی، اسے اپنا آپ ایک اپسرا کی مانند دکھائی دینے لگا۔ اس نے اپنے اس دلکش پوز کو اپنے قیمتی رنگین موبائل سیٹ کے ذریعے فیس بک پہ اس شعر کے ساتھ ڈال دیا

اک سادہ ورق تھی میری کائنات کی دنیا
رنگیں ہوئی رنگیں نگاہوں کے اثر سے

صبح سے شام تک رام دلاری کو جنس زدہ مردوں کے ایسے ایسے کمنٹس پڑھنے کو ملے کہ وہ شرم کے مارے پانی پانی ہوگئی۔ اس کے جی نے چاہا کہ اگر زمین پھٹ جاتی تو وہ اس میں سما جاتی۔ دوسرے دن اس نے نقاب پوش صورت میں اپنا فوٹو فیس بک پہ ڈالا تو اسے دین دھرم کے رسیا لوگوں کے کل پانچ کمنٹس پڑھنے کو ملے۔ رام دلاری حیران رہ گئی۔ اس کے دل و دماغ کے تمام دریچے اس تجربے کے بعد یک وقت کھل گئے۔ تب اسے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اصل میں لفظ "عورت'' کے معنی پردے میں رکھی جانے والی چیز کے ہیں۔

دو دن بعد جب رام دلاری خواتین کمیشن آفس گئی تو آگے چیر مین صاحب اونچی نرم کرسی پہ براجمان تھے، انھوں نے رام دلاری کو آفس میں آتے دیکھا تو کہنے لگے

''ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ سنایئے آپ کس نتیجے پہ پہنچیں''؟

رام دلاری نے جواب دیا

''سر......میں اپنے تجربے اور مشاہدے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچی ہوں کہ دراصل'' عورت'' نام ہے پردے میں رکھی جانے والی چیز کا اور سر یہ بات تو آپ جیسے صاحب بصیرت بخوبی جانتے ہیں کہ زَر، زن اور اَن یہ تینوں چیزیں پردہ چاہتی ہیں۔ لیکن یہی پردے کی متقاضی تین چیزیں آج کے سائنسی و تکنیکی دور میں نمائش بن کے رہ گئی ہیں۔ سر، اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتی ہوں کہ جب قانون قدرت کے خلاف انسان اس دنیا میں زندگی بسر کرے گا تو اس کے نتیجے میں تباہی کا آنا ایک فطری امر ہے''

چیرمین صاحب نے رام دلاری سے پوچھا

''مس رام دلاری، آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ''عورت'' پردے میں رکھی جانے والی چیز ہے؟ اور مجھے آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ عورت کو پردے میں رکھنا چاہتی ہیں۔ جب کہ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ پردہ عورت کی ترقی میں حائل ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے آپ سے اس سلسلے میں کوئی معقول دلیل چاہیے''

رام دلاری کہنے لگی

''سر......میں آپ کو یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ہمارے ملک میں عورتوں پہ ظلم وستم، ان کی خودکشی اور اغوا کی بنیادی وجہ ان کی بے پردگی ہے۔ اگر ہمارے ملک کی تمام عورتیں بلا لحاظ مذہب وملت پردے کو بطور تحفظ عزت وعصمت اپنا ئیں تو عورتوں سے جڑے ان تمام ظلم وزیادتیوں اور جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ جن کی وجہ سے پورا معاشرہ ایک طرح کی بحرانی صورت اختیار کر چکا ہے''

چیرمین صاحب پوچھنے لگے

''مس رام دلاری......کیا آپ عورت کو پردے میں مقید کرنا چاہتی ہیں؟''

''نہیں سر ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ عورتیں ڈاکٹر بنیں،

انجینئر بنیں، پائلٹ بنیں، ایڈمنسٹریٹر بنیں یہاں تک کہ ملک کی پردھان منتری بنیں لیکن وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ''عورت'' کے لغوی معنی پردے میں رکھی جانے والی چیز کے ہیں۔ اس لیے 'عورت' اور 'پردہ' دو لازم وملزوم چیزیں ہیں''

چیرمین صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے رام دلاری سے پوچھا

''مس رام دلاری...... مجھے تو اس بات پہ حیرت ہو رہی ہے کہ تم ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی ہو اور تمہارا نام رام دلاری ہے، لیکن اس کے باوجود تم عورت کے لیے پردے کو لازمی قرار دے رہی ہو۔ میں نے تو کچھ دیندار مسلمان خواتین کو پردے کی حالت میں دیکھا ہے۔ آخر تم پہ اس جدید ترقی یافتہ دور میں عورت کو پردے کی حالت میں دیکھنے کا جنون کیوں سوار ہوا؟''

رام دلاری نے آہستہ سے اپنے پرس میں سے اپنا قیمتی رنگین موبائل سیٹ نکالا اور کہنے لگی

سر: آپ عمر رسیدہ ہیں، میں آپ کو اپنے باپ کی طرح سمجھتی ہوں مجھ سے آپ پہلے یہ وعدہ کیجیے کہ آپ ان مردوں کو بذریعہ پولیس، سی آئی ڈی اور کرائم بیورو شدید طور پر زدوکوب کروائیں گے جنھوں نے میری فیس بک پہ فحش قسم کے کمنٹس کیے ہیں۔ مزید یہ کہ آپ کو میری ان دو تصویروں سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ عورت ذات کے لیے پردہ کتنا ضروری ہے'' یہ کہتے ہوئے رام دلاری نے موبائل سیٹ چیرمین صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ چیرمین صاحب نے جونہی پہلا کمنٹ پڑھا تو وہ انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے اور رام دلاری کو کہنے لگے

''ان بدمعاشوں کی فہرست تیار کرو ہم انھیں جیل بھجوائیں گے''

....

سب کی ماں

بہاراں، بیاسی سال کی ہو چکی تھی۔ زندگی کی بیاسی بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اس کے حواس خمسہ میں ضعف کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ البتہ لاٹھی ٹیکنے کی عادی تھی اور کہا کرتی تھی کہ آدمی شہر کا ہو یا دیہات کا اسے گھر سے باہر جاتے وقت ہاتھ میں لاٹھی ضرور رکھنی چاہیے۔ کیونکہ کیا معلوم کب کہاں کوئی بندر، کتا، بھینسہ، بیل، گھوڑا یا کوئی اور جانور حملہ آور ہو جائے۔ اس کے چہرے کی جھریوں کی جھالر یہ عیاں کر رہی تھی کہ وہ زندگی کے کئی نشیب وفراز دیکھ چکی ہے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیوں کی ماں تھی۔ اس کا رفیق حیات اپنا حق رفاقت ادا کرتے ہوئے بہت پہلے دنیا سے چل بسا تھا۔ دونوں بیٹے وفادار بھی تھے اور خوشحال بھی۔ اس کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں تک کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں نے اپنے قصبے کے راج محل کی زیب وزینت دیکھی تھی، راجکماروں کے پالنوں کو جھلایا تھا، اپنے ملک کے بٹوارے کی خبر سن کر آنسو بہائے تھے اور پھر آدمی کی شکل میں حیوانی درندگی کا بھیانک رقص دیکھا تھا۔ پھر ایک وقت اس کی زندگی میں ایسا بھی آیا تھا جب اس کی آنکھوں نے اپنے قصبے کے ویران وسنسان راج محل میں دور سے ''جانی دشمن'' فلم کی شوٹنگ دیکھی تھی۔ زندگی کا اتنا تلخ وشیریں رس پینے کے باوجود بہاراں کے چہرے سے نورانیت ٹپکتی تھی اور لب ولہجے میں بزرگانہ طمطراق موجود تھا۔ لگتا تھا کہ زندگی اسے تھکا دینے میں ناکام ہو چکی ہے۔ مقام حیرت تو یہ تھا کہ وہ اس عمر میں بھی نماز، روزے اور ذکر واذکار کی پابند تھی۔ قرآن پاک پڑھنا نہیں جانتی تھی لیکن اس کے باوجود بڑی عظمت وعقیدت کے ساتھ قرآنی حروف پہ شہادت کی انگلی پھیرتی۔ اس سے اس کے دل کو تسکین پہنچتی اور

آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اس کی خوشی کی کوئی حد اس وقت نہیں رہتی جب وہ اپنے قصبے کے مرکزی مقام چنار چھاوں میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی برادری کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور پھل کھاتے دیکھتی، تب اسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے یہ سب اسکے بطن سے پیدا ہوئے ہوں۔ اس کے اس احساس مسرت کا تعلق اسکی عملی زندگی سے بھی تو رہا تھا کیونکہ وہ اپنے قصبے کی مشہور ہنر مند دائی تھی۔ اس لیے وہ یہ جانتی تھی کہ اسکے سامنے یہ مشترکہ نئی نسل اس کے ہاتھوں شکم مادر سے اس جہان رنگ و بو میں آئی ہے۔ بہاراں، بے لوث خدمت کے سبب اپنے قصبے میں مشترکہ تہذیب کا استعارہ بن کے رہ گئی تھی۔ وہ تو اس وقت سے دائی کا کام کرتی آ رہی تھی جب اسکے قصبے کے مکانات کچے ہوا کرتے تھے اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال نے انسانی رشتوں کے تقدس کو پامال نہیں کیا تھا۔ سینکڑوں بچوں کو اس نے ماں کی کوکھ سے زمین کی کوکھ پہ قدم رکھتے دیکھا تھا۔ اللہ تعالے نے نہ جانے اس کے ہاتھوں میں کیا جادو رکھا تھا کہ جس بھی حاملہ عورت کے دردزہ کو دیکھ کے ڈاکٹر لوگ گھبرا کے بڑے شہر میں لے جانے کو کہتے اسے بہاراں اپنی تحویل میں لیتی اور ایک دو بار ہاتھ پھیرتے ہی بچی یا بچہ تولد ہوتا۔ ایک بار جب رات کو دھنو دھوبی کی بیوی آرتی کے شریر میں دردزہ کی ترنگ اٹھی تو وہ حواس باختہ سا دوڑتا بھاگتا بہاراں کے گھر پہ آیا اور زور سے پکار اٹھا

''دائی ...... میری دھرم پتنی کو بچہ درد تڑپائے جات ہے، چل کے دیکھونا''

بہاراں، اپنے کچے مکان میں میٹھی نیند سوئی ہوئی تھی۔ دھنو دھوبی کی پکار سے وہ جاگ گئی۔ اس کے ماتھے پہ شکنیں سی ابھر آئی تھیں اور تب اس نے دھنو دھوبی کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا

''اے ایسے نہیں بولتے، مجھے تمہارا بولنا اچھا نہیں لگا۔ جب ایسی بات ہو تو مجھے اس طرح آواز دیا کرو' اماں ...... درد' میں سمجھ جایا کروں گی کہ میرے قصبے کی کوئی بہو، بیٹی

دردزہ کے باعث زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے''

دھنو نے کہا تھا

''ہاں میں ایسے ہی پکاروں گا اور دوسروں کو بھی یہ بات بتاوں گا۔مگر اماں آپ چلیں تو سہی''

بہاراں ایک چھوٹا سا تھیلا بغل میں دبائے دھنو کے ساتھ چل پڑی تھی۔آگے دھنو کے گھر میں اسکی بیوی آرتی دردزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی۔اسکی دلدوز چیخیں سن کے دھنو کا دل دہل جاتا۔ بہاراں نے جاتے ہی اپنے ہاتھوں میں پتانہیں کون سا تیل لگایا تھا اور پھر آہستہ آہستہ آرتی کے شریر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد آرتی کی کوکھ سے ایک سندر سلونا سا بچہ اس جہان فانی میں آ گیا تھا۔نومولود کی پہلی چیخ سن کر دھنو دھوبی کے جسم میں جان آ گئی تھی۔اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا تھا

''اماں......بھگوان آپ کو سدا سکھی رکھے۔آپ جگ جگ جئیں''

وہ ذچہ اور بچہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا اور پانچ سو روپے کا نوٹ بہاراں کو دیتے ہوئے کہنے لگا تھا

''اماں، یہ لیجیے میرا دل آج خوش ہوا ہے'' بہاراں نے لینے سے انکار کیا تھا۔ لیکن دھنو نے زبردستی پانچ سو روپے کا نوٹ پکڑا دیا تھا۔ پھر وہ دھنو کے گھر سے رخصت ہو گئی تھی اور ٹارچ کی روشنی میں اکیلی اپنے کچے مکان میں پہنچ گئی تھی۔

لالہ نند لال، بہاراں کے قصبے کا سب سے بڑا سیٹھ تھا۔ دیوالی، ہولی اور نوراتروں میں ان کے گھر میں دیسی گھی کے چراغ جلا کرتے تھے۔ایک رات جب ان کی بہو شادی کے سات سال بعد پہلی مرتبہ دردزہ سے کراہ اٹھی تھی تو لالہ نند لال اسپتال جانے کے بجائے خود بہاراں کے کچے مکان میں آئے تھے۔انھوں نے آواز دی تھی

''اماں......درد'' بہاراں نماز تہجد پڑھ چکی تھی اور دعا مانگنے میں مشغول تھی۔ سیٹھ

نندلال نے دوبارہ آواز دی تھی

''اماں......درد''

بہاراں اندر سے بولی تھی

''ٹھہر جائیے آ رہی ہوں''

چند لمحوں بعد وہ لالہ نندلال کے حویلی نما مکان میں پہنچ گئی تھی۔ جاتے ہی اس نے اپنے ہاتھوں میں تیل لگایا تھا۔ اللہ کا نام لے کر آہستہ آہستہ لالہ نندلال کی بہو کے مخملیں شریر پہ دونوں ہاتھ پھیرے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اسکے دردزہ میں افاقہ ہوا تھا اور بہو نے ایک خوبصورت سی بالکہ کو جنم دیا تھا۔ لالہ نندلال خوش ہوئے تھے لیکن ان کا بیٹا نیرج کسی حد مایوس ہوا تھا۔ لالہ نندلال نے بہاراں کی گودگری چھواروں سے بھر دی تھی۔ ایک ہزار روپے کا نوٹ، تانبے کی تھالی اور پیتل کی بالٹی دی تھی اور ان کی بیوی نے اپنے کان میں لگی سونے کی ایک بالی اتار کے دی تھی۔

اپنے کچے مکان میں پہنچتے ہی بہاراں کے پوتے پوتیوں نے اسکے ہاتھ میں گری چھواروں سے بھری پوٹلی دیکھ کر اسے گھیر لیا تھا۔ دادی دادی کی رٹ لگائے وہ اس سے پوٹلی لینا چاہتے تھے۔ مگر اس نے کسی کو بھی پوٹلی نہیں دی تھی۔ اس نے سب کو نیچے بٹھایا تھا اور اپنے ہاتھ سے ان میں برابر گری چھوارے بانٹ دیے تھے۔ اسکے دونوں بیٹوں کے پکے مکان تھے۔ دونوں سرکاری ملازم تھے۔ دونوں ماں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بہاراں نے ساس بہو کے رشتے کو ماں بیٹی کے رشتے میں بدل دیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی

''ہر ساس اگر بہو کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھے تو کوئی بھی گھر برباد نہیں ہوگا''

بہاراں کو اپنے چھوٹے سے کچے مکان میں بہت سکون ملتا تھا۔ کھانا تو وہ خود نہیں پکاتی تھی البتہ صبح لپٹن چائے کا ایک کپ خود بنا کر پی لیتی تھی۔ اسے رسی کی کھاٹ پہ سونا بہت اچھا لگتا تھا۔ دونوں بیٹوں نے جب اسے ایک خوبصورت بیڈ اور بستر خرید کر دیا تو وہ

ان سے ناراض ہوئی تھی اور کہنے لگی تھی

''میں رات کو تہجد پڑھتی ہوں۔ تمہارے اس نرم گرم بستر پہ جب لیٹوں گی تو میں کہاں جاگ پاؤں گی۔ قبر میں یہ نرم گرم بستر تو نہیں ہوگا''

بہاراں کے قصبے میں مثالی قسم کی رواداری اور بھائی چارہ موجود تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی آپس میں ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ دیوالی اور عید کی خوشیاں آپس میں بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے، لیکن اس خوش کن ہندو مسلم بھائی چارے کو اس وقت نظر بد لگ گئی جب قصبے میں نہ جانے کہاں سے دو لنگور آ کے بندروں پہ جھپٹ پڑے اور انھیں نوچنا کھسوٹنا شروع کردیا۔ لنگوروں اور بندروں کے درمیان مہا بھارت دیکھنے کے لیے مرد عورتیں اور بچے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ چند ہندو لڑکوں نے بندروں کو اس لیے بچانے کی کوشش کی کہ بندر ہمارے اس قصبے میں 80 سال سے رہ رہے ہیں جب کہ لنگور پہلی بار اس قصبے میں کہیں سے آ نکلے ہیں۔ مسلمان لڑکے یہ چاہتے تھے کہ لنگور، بندروں کو پٹک پٹک کے ماریں کیونکہ ان بندروں نے پورے قصبے کے لوگوں کا ناک میں دم کردیا تھا۔ بندر گھروں میں گھستے تھے اور اندر سے کپڑے، کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے تھے اور بعض اوقات بوڑھوں اور بچوں پہ جھپٹ پڑتے تھے۔ ہندو اور مسلمان لڑکے دو متضاد نظریے کے تحت چل رہے تھے کہ ان میں آپس میں تُو تُو میں میں اور دھکا مکی کی نوبت آ گئی۔ بندر اور لنگور دونوں قسم کے جانور تو وقتی طور پر قصبے کی فصیل پھاند کر کہیں دور چلے گئے لیکن قصبے میں فرقہ پرستی کا زہر چھوڑ گئے۔ ''بولو شری ہنومان جی کی جے'' اور ''اسلام زندہ باد'' کے نعرے فضا میں گونجنے لگے کہ اتنے میں پولیس آ گئی تھی اور اس نے ان مشتعل نوجوانوں کو حراست میں لے لیا تھا۔ دوسرے ہی دن قصبے کے کچھ سنجیدہ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی لوگوں نے گذشتہ روز ہندو مسلم نوجوانوں کی نازیبا و ناشائستہ حرکت کے بارے میں ایک میٹنگ بلائی۔ دونوں فرقوں کے لڑکے اس میٹنگ میں شامل ہوئے۔ بہاراں بھی اس میٹنگ میں

بن بلائے چلی آئی تھی۔ اس کے آتے ہی سب لوگ کھڑے ہوکر بیٹھ گئے۔ سب نے نوجوان لڑکوں کی سرزنش کی، انھیں اپنی غلطی کا احساس دلایا۔ آخر پر بہاراں نے بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا

''تم سب کو اپنے خاندان کے لوگ سمجھتی ہوں۔ میرے ہاتھوں تمہارا جنم ہوا ہے۔ میری آنکھوں نے تمہارا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ دیکھا اور اس عمر میں اب تمہارا بڑھاپا دیکھ رہی ہوں۔ میں خواب ڈوبتے سورج کی کرن کی مانند ہوں۔ دنیا کی سب سے انمول نعمت دل کا سکون ہے۔ اتفاق و اتحاد کی نعمت کو نہ کھونا۔ میرے قصبے میں رہنے والے مسلمان اور ہندو میری آنکھیں ہیں، سکھ اور عیسائی میرے بازو۔ کل جن بچوں نے غلط حرکت کی ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے معافی مانگیں اور ایک دوسرے کے ساتھ گلے ملیں ورنہ مجھ بوڑھی کا دل روتا رہے گا''

آخری جملہ کہتے ہوئے بہاراں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میٹنگ ایک خوشگوار ماحول میں اختتام پزیر ہوئی تھی۔ آخر پر حلوہ بانٹا گیا۔ ایک ہفتے کے بعد بہاراں نے اپنی دونوں بہوؤں کو اپنے پاس بلایا۔ اپنی چھوٹی سی المونیم کی صندوقچی کھولی، اس میں سے بیس ہزار روپے نکال کر دونوں کو دس دس ہزار دے دیے۔ دوسرے دن اپنی بیٹیوں کو بلایا اور ان کو بھی دس دس ہزار روپے دے دیے۔ ایسا کرنے سے اسے سکون سا ملا تھا۔ تیسرے دن ہلکی سی بارش ہوئی تھی۔ نماز عصر کا وقت تھا۔ وہ وضو بنانے کے لیے جونہی اندر سے باہر نکلی تو اس کے دونوں پیر پھسل گئے اور وہ چاروں شانے چت نیچے گر گئی۔ اسکی چیخ سن کر گھر کے تمام افراد اسکی طرف دوڑ پڑے۔ پوتے پوتیاں چیختے ہوئے دادی دادی پکارنے لگے اور دونوں بہو، بیٹے ماں کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر روتے ہوئے اماں اماں پکارنے لگے۔ انھوں نے فوراً ماں کو اٹھایا اور گاڑی میں رکھ کر اسپتال لے گئے۔

اسپتال پہنچتے ہی اس نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں اور پھر کلمہ پڑھتے ہوئے

دم توڑ دیا۔اس کے باغ کے تمام پھول بیک وقت اسکے صدمے سے مرجھا گئے۔اک کہرام سا مچ گیا۔ یہ مایوس کن خبر پورے قصبے میں چند لمحوں میں پھیل گئی۔جس نے جہاں سنا وہ وہیں سے اسپتال کی جانب دوڑ پڑا۔ جب لاش گھر پہنچائی گئی تو سب نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ میت کی تجہیز وتکفین کل ہوگی۔ساری رات گھر کے تمام افراد نے روتے بلکتے گزار دی۔ دوسرے دن قصبے کے تمام دکان داروں نے دکانیں بند رکھی۔ پورے قصبے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔میت کو غسل اور کفنانے کے بعد جب تابوت میں رکھا گیا تو آخری دیدار کے لیے گھر کے تمام افراد کو بلا گیا۔ بہاراں دائی کا چہرہ بہت زیادہ نورانی نظر آرہا تھا۔یوں معلوم ہورہا تھا کہ جیسے وہ مسکرارہی ہوں۔ جونہی تابوت اٹھانے لگےتو ہندو اور سکھ برادری کے لوگ آگے آئے۔انھوں نے میت کو پہلے کندھا دیا۔ لالہ نندلال نے روتے ہوئے ایک سفید قیمتی چادر تابوت کے اوپر ڈال دی۔دھنودھوبی دھاڑیں مار مار کر رورہا تھا۔سکھ رشپال سنگھ نے روتے ہوئے ایک آدمی سے کہا

''بہاراں مائی، کی موت ہم سب کی موت ہے۔ کیونکہ اب ہمارے قصبے کی کوئی بھی عورت بغیر آپریشن کے بچہ نہیں جنے گی''

....

ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی

لعل محمد جب جی پی فنڈ آفس سے باہر نکلے تو غم و غصے کے مارے ان کا جی چاہ رہا تھا کہ جی پی فنڈ آفس کے بار بار چکر کاٹنے سے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنی بیس سالہ سروس کے دوران سرکاری خزانے میں جمع شدہ اپنی سات لاکھ روپے کی رقم سے متعلق اپنی اس فائل کے ہر کاغذ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دے جسے تیار کروانے میں انھوں نے پورے ایک سال تین ماہ کا عرصہ بیتا دیا تھا۔ وہ محکمہ باغبانی میں تیسرے درجے کے ملازم تھے۔ بیس برس محکمہ باغبانی میں اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی اور ایمانداری سے انجام دے چکے تھے۔ دس سال سروس ابھی باقی تھی۔ آدمی شریف۔ دیانتدار۔ حق پرست۔ محنتی۔ ذہین اور بہترین حسن اخلاق و کردار کا مالک ہو تو جدید معاشرے کے منافق۔ حاسد۔ عیار۔ مکار اور رنگ سیار قسم کے لوگ اسے برداشت نہیں کرتے اور ایسی جملہ صفات کا حامل آدمی اکثر پریشان رہتا ہے کیونکہ جب سماج میں برے لوگوں کا گراف بڑھ جاتا ہے تو اچھے لوگوں کی آواز صدا بصحرا یا نقار خانے میں طوطی کی آواز کی مانند بے معنی و بے اثر ہو کے رہ جاتی ہے۔ لعل محمد کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان کی مومنانہ وضع قطع۔ چال ڈھال۔ لب ولہجہ اور عاجزی وانکساری سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے جسم و جاں میں ایک شریف النفس۔ امن پسند۔ دیانتدار اور خدا دوست انسان براجمان ہے جو باہر کے خباثت آمیز ماحول ومعاشرے کو دیدۂ حیراں سے دیکھ رہا ہے۔ بیس برسوں میں انھوں نے مختلف مقامات پہ ملازمت کے فرائض انجام دیے تھے۔ ان تمام دفتروں کے کلرکوں اور آفیسروں نے لعل محمد کو کافی ادھر ادھر دوڑایا تھا۔ بہت سی ذہنی و روحانی کوفتیں برداشت کرنے کے بعد ان کی فائل

خدا خدا کر کے ہیڈ کلرک کے پاس پہنچی تھی۔لیکن اب یہاں بھی وہ دو مہینے میں کئی چکر لگا چکے تھے۔ ہیڈ کلرک ہر بار لعل محمد کے چہرے پر کم اور انکے ہاتھوں کی طرف زیادہ دیکھتا تھا۔ فائل کبھی چھوٹے کلرک۔ کبھی بڑے کلرک کے ٹیبل پہ اور کبھی کمپیوٹر سیکشن میں گشت کرتے کرتے یوں لگ رہی تھی کہ جیسے کوئی دکھیاری عورت اپنا دکھڑا سنا رہی ہو۔

لعل محمد جب چند دنوں کے بعد ایک دن پھر اپنے جی پی کیس کے سلسلے میں جی پی فنڈ آفس پہنچے تو انھیں یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ ہیڈ کلرک ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔ وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ بار بار جی پی فنڈ آفس کے چکر لگاتے لگاتے اب وہ تنگ آ چکے تھے۔ وہ پچھتر فیصدی جی پی نکلوانا چاہتے تھے کیونکہ حال ہی میں ان کی بیٹی کا رشتہ ایک ڈاکٹر سے طے ہوا تھا۔لڑکے والوں نے اپنی مرضی کا جہیز لینے کے لیے مختلف چیزوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست لعل محمد کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔ انھوں نے موبائل سیٹ اپنی جیب سے نکالا اور ہیڈ کلرک کا نمبر ڈائل کیا۔ دو تین بار نمبر ملانے کے بعد آگے سے ہیڈ کلرک بولا

''کون؟''

لعل محمد بولے'' جناب...... جناب میں لعل محمد عرض کر رہا ہوں۔ بھائی صاحب میری اس فائل کا کیا ہوا؟''

کلرک نے پوچھا

''کون سی فائل؟''

لعل محمد نے جواب دیا

''بھائی صاحب میری وہ جی پی نان ری فنڈ ایبل والی فائل''

ہیڈ کلرک نے بڑے کرخت لہجے میں کہا

''فائل دیے ابھی دو ماہ ہی ہوئے ہیں۔ کوئی زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا اور تم لوگ پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔صبر نام کی کوئی بھی چیز تم لوگوں میں نہیں ہے'' یہ کہنے کے فوراً بعد ہیڈ

کلرک نے فون کاٹ دیا۔لعل محمد دل ہی دل میں تلملا کے رہ گئے۔انھیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی غصیل بندر نے ایک ہی جست میں ان کا چہرہ نوچ لیا ہو۔پورے ایک ہفتے کے بعد جب لعل محمد جی پی فنڈ آفس پہنچے تو انھیں ہیڈ کلرک اونچی نرم کرسی پہ بیٹھا سگرٹ کے کش لیتا نظر آیا۔وہ پُر امید اسکے کمرے میں گئے۔ ہیڈ کلرک نے پوچھا

''بتاؤ کیسے آنا ہوا؟''

لعل محمد بولے'' جناب مجھے لعل محمد کہتے ہیں۔آپ کے پاس میری جی پی نان ری فنڈ ایبل فائل آئی ہے۔ میں پچھتر فیصدی جی پی نکالنا چاہتا ہوں۔میری بیٹی کی شادی ہے مجھے تین لاکھ روپے کی اشد ضرورت ہے''

ہیڈ کلرک نے اپنی یاداشت پہ زور دیتے ہوئے کہا

''ہاں تمہاری فائل میرے ٹیبل پہ آئی تھی۔ میں دیکھتا ہوں''اس نے پہلے تو اپنے ٹیبل پہ پڑی کوئی ایک درجن سے زائد فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی ایکٹینگ کی پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سامنے شیلف میں رکھی فائلوں پہ نظر دوڑائی اور کہنے لگا

''تمہاری فائل ڈھونڈنی پڑے گی۔تم باہر جاؤ۔دھوپ تاپو سردی کا موسم ہے''

لعل محمد باہر آکر بینچ پہ بیٹھ گئے۔ان کے دل ہی دل میں افسردگی کی گھٹا چھا گئی۔ تب وہ سوچنے لگے یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر میری فائل اس ہیڈ کلرک کے ہاتھوں میں آنے کے بعد کہاں گئی! ان کے ذہن ودل میں سوچ وتشویش کے دائرے پھیلتے جا رہے تھے کہ اتنے میں چھوٹا کلرک ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور لعل محمد سے پوچھنے لگا

''لعل محمد آپ ہیں؟''

''جی میں ہی لعل محمد ہوں''،لعل محمد کے چہرے پہ یہ سوچ کے خوشی کے آثار نمودار ہوئے کہ ہیڈ کلرک کو میری فائل مل چکی ہوگی۔اس لیے چھوٹے کلرک کو میرے پاس بھیجا ہوگا لیکن چھوٹے کلرک نے انھیں متوجہ کرتے ہوئے کہا

’’دیکھئے لعل محمد صاحب مجھے آپ نہایت سیدھے سادے اور شریف آدمی معلوم ہو رہے ہیں مجھے ہیڈ کلرک صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی فائل تیار ہونے میں ابھی ایک ہفتہ اور لگے گا۔ فائل تیار ہو جائے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو دس ہزار روپے بطور نذرانہ اور وہسکی کی بوتل ہیڈ کلرک کو میرے ذریعے پیش کرنی ہوگی۔ کیونکہ وہ کھانے پینے والے آدمی ہیں۔ اس لیے ان دو چیزوں کے بغیر آپ کا کام نہیں ہوگا۔ بس یوں ہی آپ یہاں آتے رہیں گے۔‘‘

کلرک کی باتیں سن کر لعل محمد کے چہرے کا رنگ بیک وقت فق ہو گیا۔ ان کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ ان پہ ایک طرح کی ہذیانی کیفیت طاری ہوئی۔ نگاہیں نیچی کیے وہ وقفے وقفے کے بعد کہنے لگے

’’دس...... ہزار...... روپے...... اور...... وہسکی کی...... بوتل‘‘ انھوں نے کلرک کو ہاں ناں میں کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے انکا سارا وجود مفلوج ہو گیا ہو۔ وہ آہستہ سے اٹھے اور سیدھے اپنے گھر چلے آئے۔ ان کی بیگم کہکشاں نے انھیں مایوس دیکھا تو قریب آ کر بڑے پیار سے پوچھنے لگی

’’تمہارے من کے کتوبر کی چہکار آج مجھے سنائی نہیں دے رہی ہے۔ بڑے مایوس دکھائی دے رہے ہو۔ بات کیا ہے؟‘‘

لعل محمد نے جواب دیا

’’ظالموں کے ظلم اور منافقوں کی منافقت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ میری جی پی فنڈ کی فائل ایک کلرک کے ہاتھوں گم ہو جاتی ہے اور دوسرے کلرک کو ملتی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے کھان پان کے چکر میں الجھا کے رکھ دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کہاں جاؤں‘‘!

لعل محمد کی بیوی کے حسین چہرے پہ خفگی کے آثار نمودار ہوئے وہ تنک کر بولی

’’آپ کو اپنا حق لینا نہیں آتا۔ ان لوگوں نے آپ کے شریفانہ تیور دیکھ لیے ہیں

اسی لیے آپ کو بدھو بنا رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ جاتی تو ان کو مزہ چکھاتی''

لعل محمد دیر تک بیوی کی باتیں سنتے رہے لیکن کچھ بھی نہیں بولے، رات کو کھانا کھانے کے بعد جب وہ شبستان میں گئے تو اچانک انھیں ٹھاکر دھیان سنگھ یاد آئے جو حال ہی میں میونسپل کمیٹی کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوکر میونسپل کمیٹی کے صدر بنائے گئے تھے۔لعل محمد نے دوسرے دن ان سے ملنے کا ارادہ کیا۔

دوسرے دن جب لعل محمد ٹھاکر دھیان سنگھ کے گھر پہنچے تو انھیں ان کا مکان دیکھ کے یوں لگا کہ یہ کسی منسٹر کی کوٹھی ہے۔ رنگ وروغن سے سجی سنوری یہ کوٹھی دلہن کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ گیراج میں چمچماتی بلیرو گاڑی یہ ظاہر کررہی تھی کہ اس جمہوری دور میں بھی راجپوتانہ شان وشوکت برقرار ہے۔لعل محمد نے آہستہ سے گیٹ پہ لگی بیل کا بٹن دبایا تو اندر سے یہ دُھون سنائی دی۔''میرے آنگنے میں تمہارا کیا کام ہے''؟ اوراس کے ساتھ ہی لان میں ایک طرف بندھا ولائتی نسل کا کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ٹھاکر دھیان سنگھ کے خادم نے گیٹ کھولا لعل محمد ڈرے سہمے سے اندر داخل ہوئے۔ خادم نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔لعل محمد نے خادم سے پوچھا کہ ٹھاکر صاحب کہاں ہیں تو اس نے کہا کہ وہ پوجا پاٹھ کررہے ہیں۔ کچھ ہی وقت کے بعد ٹھاکر دھیان سنگھ ڈرائنگ روم میں آئے۔لعل محمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ آداب بجالاتے ہوئے وہ بیٹھ گئے۔ٹھاکر دھیان سنگھ کا چہرہ مہرہ اور قد کاٹھی سے یہ معلوم ہورہا تھا کہ وہ بارعب شخصیت کے مالک ہیں۔انھوں نے پہلی فرصت میں ٹیبل بیل بجائی۔ خادم ان کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہوا۔انھوں نے اسے چائے پانی لانے کو کہا اور پھر لعل محمد سے مخاطب ہوئے۔

''کہیے میرے لائق کیا حکم ہے''؟

''ٹھاکر صاحب حکم نہیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں محکمۂ باغبانی میں تیسرے دوجے کا ملازم ہوں۔ بیس برس میں اس محکمے کو دے چکا ہوں۔ ابھی دس سال

میری سروس باقی ہے۔ میرا اپنا ہی سرکاری خزانے میں جمع شدہ پیسہ جو جی پی فنڈ کی صورت میں موجود ہے۔ اس کا پچھتر فیصدی جی پی نکالنا چاہتا ہوں۔ میری بیٹی کی شادی کا مسلہ ہے۔ میری فائل ہیڈ آفس میں تقریباً تین ماہ سے کلرکوں کے ہاتھوں میں کبھی گم ہو جاتی ہے۔ کبھی وہ انھیں مل جاتی ہے اور اب وہ ہیڈ کلرک کے پاس ہے۔ وہ بھی ٹال مٹول کر رہا ہے۔ آپ سے سُجھاؤ چاہتا ہوں کیا کروں''؟

ٹھاکر دھیان سنگھ نے اپنی مونچھوں پہ تاو دیتے ہوئے کہا

''لعل محمد صاحب۔ میری باتیں غور سے سن لیجئے اور ان پہ عمل بھی کیجئے۔ زیادہ شریف بن کے رہیں گے تو سماج کے بُرے لوگ آپ کے کپڑے بھی اتار کے لے جائیں گے۔ میرا اصول تو یہ ہے کہ میں صرف بھگوان سے ڈرتا ہوں۔ سچ بولتا ہوں چاہے میری جان چلی جائے۔ غلط کام نہ خود کرتا ہوں اور نہ ہونے دیتا ہوں۔ اپنا حق لینے کے لیے میں مہذب رویہ اختیار کرتا ہوں۔ اسکے بعد اگر کسی نے میرا حق چھیننے کی کوشش یا کوئی زیادہ ہوشیاری دکھانے لگا تو پھر میں ڈنڈے اور کالی سفید گالیوں سے کام لیتا ہوں۔ کیونکہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا ہے یا پھر آپ نے یہ مشہور ضرب المثل تو سنی ہوگی کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ لہٰذا میری یہ بات یاد رکھئے کہ جب سماج کے منافق۔ حاسد۔ غنڈے اور بدمعاش قسم کے لوگ کسی کی شرافت۔ دیانتداری۔ بہترین اخلاق وکردار اور تہذیب وشائستگی کا مذاق اڑانے لگیں تو انھیں راہ راست پر لانے کے لیے ڈنڈا اور کالی سفید گالیاں ایک موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہیں''

خادم چائے لے کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور چائے ٹیبل پہ رکھ کے باہر چلا گیا۔

چائے نوش فرمانے کے دوران لعل محمد نے بڑی معصومیت سے ٹھاکر دھیان سنگھ سے پوچھا

''ٹھاکر جی ڈنڈا کس قسم کا ہونا چاہیئے؟''

ٹھاکر دھیان سنگھ کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکان پھسل گئی۔ انھوں نے کہا

''بہتر تو یہ تھا کہ آپ پیتل کا ڈنڈا ہر وقت اپنے پاس رکھتے۔لیکن چونکہ آپ ابھی نئے ہیں اس لیے لکڑی کا ڈنڈا ہی چلے گا''

لعل محمد نے کہا'' ٹھاکر جی میں سفید اور کالے رنگ کی گالیوں کی وضاحت چاہتا ہوں۔میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ یہ سفید اور کالے رنگ کی گالیاں کیا ہوتی ہیں اور کیسے دی جاتی ہیں؟''

''لعل محمد صاحب۔ سفید گالیاں اشاروں۔ کنایوں۔ تشبیہوں۔ علامتوں۔ استعاروں۔طنز و رمز کی صورت میں دی جاتی ہیں۔ جبکہ کالے رنگ کی گالیاں سیدھی چہرے پہ دی جاتی ہیں۔ جو چھاتی اور پشت کو چیرتی ہوئی باہر نکل جاتی ہیں''

لعل محمد جب ٹھاکر دھیان سنگھ سے رخصت ہونے لگے تو ٹھاکر دھیان سنگھ کہنے لگے

''لعل محمد صاحب ٹھریے۔ میں بھی آپ کے ساتھ بازار کا چکر لگا کے آتا ہوں۔ انھوں نے انگریزی سوٹ زیب تن کیا اور تقریباً چار فٹ لمبا پیتل کا ڈنڈا ہاتھ میں اٹھایا اور لعل محمد کے ہمراہ گھر سے باہر نکل آئے۔ جب وہ دونوں بازار میں سے گزرنے لگے تو دکاندار ٹھاکر دھیان سنگھ کو دیکھ کے انھیں دونوں ہاتھ جوڑ کے پرنام کرنے لگے۔ کچھ وقت کے بعد لعل محمد ٹھاکر دھیان سنگھ سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے

''اچھا ٹھاکر جی اب میں آپ سے رخصت چاہتا ہوں'' ٹھاکر دھیان سنگھ نے لعل محمد سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگے

''لعل محمد صاحب۔اپنا حق لینے کے لیے ہاتھ میں ڈنڈا رکھئے اور منہ میں گالی''

لعل محمد کہ جنھوں نے بچپن ہی سے اپنے خاندان والوں کی بہترین تربیت میں رہ کر قران مجید۔احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ۔صحابہ کرام ۔بزرگان دین۔اولیائے کرام اور صوفیوں سنتوں کی بصیرت افروز باتیں سیکھی تھیں۔وہ ان کے ذہن و دل پہ نقش ہو کے رہ گئی تھیں۔لیکن آج اس عمر میں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اب انھیں ٹھاکر دھیان سنگھ کا

مشورہ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ڈنڈے بازی اور کالی سفید گالیاں دینے کی تربیت وہ کہاں سے حاصل کریں۔ڈنڈے اور گالی کا تصور ذہن میں آتے ہی ان کا وجود کانپ جانے لگا اور جب وہ اپنے گھر کے آنگن میں پہنچے تو انھوں نے آسمان کی وسعتوں میں نظریں دوڑائیں اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔

....

معاوضہ

جاڑے کا موسم تھا۔ دوپہر کے تین بج چکے تھے۔ آسمان پہ بادل سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ وہ کبھی سورج کو اپنی آغوش میں چھپا لیتے اور کبھی سورج اپنی تمازت سے انھیں دور بھگانے میں کامیاب ہو جاتا۔ کرم دین اپنی رفیقہ حیات ماہ رخ، اپنی کمسن تین بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے کے ساتھ بیٹھے ''حرام وحلال'' کے موضوع پہ گفتگو کر رہے تھے کہ اسی دوران ان کے حویلی نما مکان کے اندرون میں بڑی سریلی آواز میں یہ ٹیون گونجنے لگی۔

اے مالک تیرے بندے ہم ایسے ہوں ہمارے کرم
نیکی پر چلیں اور بدی سے ٹلیں تا کہ ہنستے ہوئے نکلے دم

کرم دین فوراً اپنے مکان کے گیٹ کی طرف لپکے۔ باہر گیٹ پر ہندی کے پروفیسر دھرم چند کھڑے گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کرم دین کی نظر جونہی اپنے گہرے دوست کے ہشاش بشاش چہرے پر پڑی تو خوشی کے مارے ان کا چہرہ بھی گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔ دونوں گہرے دوست بڑے پُر تپاک انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بغلگیر ہوئے کہ جیسے فرقہ پرستوں کو یہ سبق سکھا رہے ہوں کہ ہم ہندو اور مسلمان بعد میں ہو سکتے ہیں، پہلے ہمارا انسانی اوصاف سے متصف ہونا نہایت ضروری ہے۔ کرم دین نے دھرم چند کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ماہ رخ پہلے ہی بچوں کو لے کر اندر چلی گئی تھی۔ کرم دین نے ہنستے ہوئے کہا

''یار کب کے بچھڑے کہاں آ کے ملے۔ تجھ کو دیکھا تو مجھے اپنے بچپن، لڑکپن اور

جوانی کے دن یاد آرہے ہیں۔ پورے دس سال کے بعد ہم آج مل رہے ہیں۔ اگرچہ موبائل فون پہ اکثر ہماری باتیں ہوتی رہتی ہیں۔لیکن پھر بھی مجھے تیری یہ دوریاں اور فاصلے کبھی کبھی بے چین کر دیتے ہیں''

پروفیسر دھرم چند نے کہا

''یار اب ہم دونوں دیہاتی نہیں رہے ہیں۔ شہری ہو گئے ہیں، اور یہ تُو تُو جانتا ہی ہے کہ شہروں میں آدمی زیادہ تر بھاگ دوڑ میں رہتا ہے اور طرح طرح کے مسائل سے جھوجھتا رہتا ہے''

کرم دین نے کہا

''میرے دوست تو نے بجا فرمایا''

کچھ ہی وقت کے بعد خادم چائے پانی لے کر ڈرائنگ روم میں آیا، وہ کھانے پینے کی چیزیں ٹیبل پہ رکھ کے باہر چلا گیا۔ پروفیسر دھرم چند نے چائے پیتے ہوئے آہستہ سے اپنا بیگ کھولا اور تقریباً چار کیلو کا ایک خوبصورت پیکٹ کرم دین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے

''میرے دوست، تجھے مبارک ہو؟ شرومنی ساہتیہ پُرسکار؟ موبائل فون پہ تو مبارک باد دے چکا ہوں۔ لیکن میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ ایسے مبارک موقعے پہ تجھ سے گلے ملوں اور سامنے مبارک باد دوں۔ ایسے مواقع تو زندگی میں بار بار نہیں آتے''

کرم دین اپنی نشست سے تھوڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے

''ارے......ارے......ارے میرے دوست خیر مبارک۔ لیکن یہ تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لہذا تکلف برطرف''

پروفیسر دھرم چند نے کہا

''ارے یہ کچھ بھی نہیں ہے یار۔ ہاں یاد آیا ایک مبارک باد یہ بھی کہ پدم شری

پرسکار! کے لیے بھی تیرا ہی نام پینل میں پہلے نمبر پر ہے''

کرم دین نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور کہنے لگے

''میرے دوست۔ یہ سب اوپر والے کا کرم ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا''

پروفیسر دھرم چند بولے

''یار کرم دین، تیری ادبی سرگرمیوں نے ادبی حلقوں میں اک دھوم سی مچادی ہے۔ تیرا ناول'' چال چلن'' نہایت دلچسپی سے پڑھا جارہا ہے، اسے پڑھ کر کئی لوگ اپنے چال چلن کو درست رکھنے کی فکر میں لگ گئے ہیں اور پھر وہ تیراٹی۔وی پہ سیریل'' رشتے'' عوام میں بہت مقبول ہورہا ہے۔یار میں، میرے بچے اور تیری بھابی تیرا سیریل دیکھنے کے بعد رات کا کھانا کھاتے ہیں۔ارے وہ تیرا اسٹیج ڈراما'' وقت'' تو ابھی حال ہی میں خیال گنج ڈراما تھیٹر میں دکھایا گیا، جسے تقریباً پانچ سو ناظرین نے اس قدر پسند فرمایا کہ انھوں نے اسے دوبارہ دکھانے کی فرمائش کی ہے۔یار تیری کہانیاں تو مجھے زندگی رنگ کہانیاں معلوم ہوتی ہیں''

کرم دین نے عاجزی وانکساری کا اظہار کرتے ہوئے کہا

''میرے دوست۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔بس ایک معمولی سا انسان ہوں۔یہ تیرا حسن ظن ہے کہ تو نے میری تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے۔میں تو اپنے آپ کو مٹی خیال کرتا ہوں، کیونکہ آدم علیہ السلام کو مٹی ہی سے پیدا کیا گیا تھا اور پھر فرمان الٰہی بھی تو ہے کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا اور اسی میں ایک دن لوٹائے جاو گے اور قیامت کے دن اسی مٹی سے اٹھائے جاو گے!''

پروفیسر دھرم چند کے چہرے پہ افسردگی کے آثار نمودار ہوئے۔پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگے

''کرم دین یار۔ مجھے ایک بات کا بہت دُکھ ہے کہ تو اردو کا پروفیسر نہیں بن پایا۔

حیرت تو یہ ہے کہ دو یونیورسٹیاں تجھ پہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ کروا چکی ہیں اور تین یونیورسٹیوں میں تجھ پہ ڈاکٹریٹ کا کام ہو رہا ہے۔ بلکہ میں تو خود اپنے ہندی وبھاگ میں ''کرم دین کی کہانیوں میں ناری واد'' کے موضوع پہ ریسرچ کروا رہا ہوں۔ ڈیڑھ درجن سے زیادہ معیاری کتابوں کے قلمکار، بہت سارے پرسکار، بہت سی ڈگریاں اور اتنا نام وکام ہونے کے باوجود ابھی تک میرے دوست تو اردو کا پروفیسر نہیں بن پایا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ اسے مقدّر رکھوں یا ظلم؟''

پروفیسر دھرم چند کی باتیں سن کر کرم دین کی پیشانی پہ ہلکی سی شکنیں ابھر آئیں۔ انھوں نے کہا

''میرے دوست قطع کلامی معاف۔ اس سلسلے میں، میں ظلم کا شکار ہوا ہوں۔ مقدر کا نہیں، مقدر میرا بہت اچھا تھا اور ہے بلکہ میں یہ وثوق سے کہتا ہوں کہ دھرم چند اگر دنیا کے خوش نصیبوں کی فہرست تیار کی جائے تو کرم دین کا نام اس میں سرفہرست ٹھہرے گا اور میرا مقدر اگر اچھا نہ ہوتا تو جو کچھ تو میرے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہے، وہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں چند باتیں تیرے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ، اس دنیا کے بُرے لوگ اپنی تمام بداعمالیوں کو نوشتۂ تقدیر خیال کرتے ہیں یعنی ان کے خیال میں تمام برے کام خدا کرواتا ہے۔ منافقوں کی منافقت اور بے غیرتوں کی بے غیرتی نے مجھے بہت روحانی اذیت پہنچائی۔ میں نے اس دنیا میں آدمی کی شکل میں زیادہ تر سانپ اور بچھو دیکھے۔ میرا دھیان جب اس حقیقت کی طرف جاتا ہے کہ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی''

پروفیسر دھرم چند، کرم دین کی جذباتی باتیں سن کر مایوس سے ہوئے۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر متعجب ہوکر کرم دین سے پوچھنے لگے

''یار، اب کی بار تو مجھے پوری امید تھی کہ تو اردو کا پروفیسر بن جائے گا۔ لیکن اس

بار بھی مجھے مایوس ہونا پڑا۔ آخر وجہ کیا رہی؟ یہ چکر کیا ہے''؟

کرم دین نے جواب دیا

''میرے دوست ......میرے پاس نہ زَر تھا نہ پَر''

پروفیسر دھرم چند نے بڑی بیتابی اور تجسس آمیز رویے سے پوچھا

''تو پھر تیرے پاس کیا تھا''؟

کرم دین نے جواب دیا

''دھرم چند ......یار...... میرے پاس توحید و رسالت کی عظمت و فضیلت، پانچ وقت کی نمازوں کی ٹھنڈک، رمضان المبارک کے تیس روزوں کا تقویٰ، عشر و ذکوٰۃ کی اہمیت وافادیت اور حج وعمرہ کی تمنا تھی۔ چناں چہ دو متضاد طبعیتوں کے تصادم میں بری طرح مجھ سے میرا حق چھینا گیا''

پروفیسر دھرم چند نے کرم دین کو جھا دینا چاہا۔ انھوں نے کہا

''اردو سے بہتر تھا کہ تو ہندی یا سائنس کی طرف گیا ہوتا تو ضرور پروفیسر بن گیا ہوتا''

کرم دین نے کہا

''یار۔ اردو کے جراثیم فطری طور پر بچپن ہی سے میرے رگ وریشے میں رچ بس چکے تھے، یہی وجہ تھی کہ میں آگے چل کر اردو سے بہت زیادہ مانوس ہوا''

کرم دین کا نو سال کا بیٹا گُل مہک، پروفیسر دھرم چند اور اپنے باپ کی گفتگو کو بغور سن رہا تھا، اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا

''پاپا......کیا جنت میں بھی شعبۂ اردو قائم کیا گیا ہوگا؟ اس دنیا میں تو آپ کو آپ کا حق نہیں ملا، آخرت میں ملنے کی کوئی امید ہے''؟

کرم دین نے اپنے بیٹے کا حیرت انگیز سوال سنا تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ بالکل خاموش رہے، جیسے ان کی زبان تالو کے ساتھ چپک گئی ہو۔ لمحہ بھر کے لیے ان کے

ذہن میں عالم برزخ، منکر نکیر، روز محشر، میزان عمل، اعمال نامہ، پل صراط، جہنم اور جنت کے مناظر گھوم گئے۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کے سوال کا جواب نہیں دے پائے، سوائے اس کے کہ ان کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہنے لگے۔

....

کارِ خیر

گُل محمد نے دین داری اور دنیا داری کو آج سے چالیس برس پہلے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ جب ان کی ماں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے پورے خاندان کو روتا بلکتا چھوڑ گئی تھیں۔ گل محمد کی عمر تب اٹھارہ برس کی تھی اور وہ بارہویں جماعت کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ وہ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انتہائی ذہین، خوش مزاج و خوش اخلاق، تین بھائیوں میں وہ سب سے بڑے تھے۔ ان کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ان کے والد صاحب میونسپل کمیٹی کے چیرمین تھے۔ ماں جیسی عظیم نعمت کہ جس کے دل میں اپنی اولاد کے لیے صرف اور صرف محبت رہتی ہے۔ وہ ماں آج زمین و آسمان کی حد بندیوں سے کہیں دور آگے نکل گئی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد کے دلوں میں چھوڑ گئی تھی دائمی جدائی کا غم۔ گل محمد نے اپنی آنکھوں گھر سے اپنی ماں کا جنازہ لوگوں کے ہجوم کی صورت میں نکلتے دیکھا تھا۔ قبرستان پہنچ کر نماز جنازہ پڑھنے کے بعد جب انھوں نے اپنی ماں کی کھودی ہوئی قبر دیکھی تھی تو ان کا وجود لرز گیا تھا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے تھے۔ غم و اندوہ کے طوفان میں وہ یہ بات سوچتے رہ گئے تھے کہ وہ ماں جو کل تک گھر میں نرم قیمتی بستر پہ سویا کرتی تھیں، آج اس قبر میں تنہا بغیر بستر کے کیسے سوئیں گی اور اس قبر میں تنہا تا قیامت کیسے رہیں گی۔ کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں جا رہا ہے۔ پھر دو آدمی قبر میں اترے تھے، جوں ہی ماں کی لاش کو چند آدمی کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر قبر میں رکھنے لگے تھے تو گل محمد غم سے نڈھال چیخ مارتے ہوئے کہنے لگے تھے

''اماں......واپس آیئے......میں آپ کے بغیر نہیں جی پاؤں گا''

ان کی دلدوز چیخ سن کے چند آدمیوں نے ان کی ڈھارس بندھائی تھی۔ان کے والدِ محترم، ان کے دو چھوٹے بھائی اور کچھ رقیق القلب آدمی بھی رو پڑے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی ماں منوں مٹی کے نیچے دفنا دی گئی تھیں۔شہرِ خموشاں میں کچھ لوگ اپنے مرحومین کی قبروں پہ سورہ فاتحہ پڑھنے لگے تھے اور پھر کچھ ہی وقت کے بعد اپنے، پرائے سب اپنے اپنے گھروں کی طرف جانے لگے تھے۔ یہ سب دیکھ گل محمد کے دل و دماغ پہ کسی شاعر کے یہ حقیقت آمیز اشعار دستک دینے لگے تھے کہ

کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ گر گئے تو اعمال گئے

گل محمد کی داخلی دنیا میں ماں کی ہمیشہ کی جدائی کے غم نے بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ تب انھیں اس بات کا شدید احساس ہوا تھا کہ زندگی بہت قیمتی مگر غیر یقینی سفر ہے۔کیا معلوم کب روح جسم کا ساتھ چھوڑ دے۔دوست یار سب مطلب کے یار ہوتے ہیں۔آدمی اس دنیا میں تنہا آتا ہے اور یہاں سے تنہا جاتا ہے۔ سب آخری وقت میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ قبرستان سے تقریباً تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو نکل گئے تھے اور کچھ لوگ اپنے ہاتھوں میں لگی مٹی کو جھاڑ رہے تھے کہ گل محمد کو انھیں دیکھ کر اپنے ایک دوست کا یہ شعر یاد آیا کہ

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے بعد دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے کہ منہ پھیر کر نہ دیکھا

گل محمد نے اپنی ماں کی موت کے بعد یہ مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا ایک بھی لمحہ منشائے الٰہی کے بغیر نہیں گزاریں گے۔انھوں نے پہلے تو کمپیوٹر سائنسز میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کیا۔ پھر ایک

پرائیویٹ کمپنی میں ملازم بھرتی ہوئے۔فرخندہ نام کی ایک پوسٹ گریجویٹ لڑکی کے ساتھ ان کا نکاح ہوا۔ بیوی کے آنے سے گھر میں رونق سی آگئی تھی۔گل محمد صوم وصلوٰۃ کے پابند، تلاوت کلام پاک کے بغیر انھیں چین نہیں آتا تھا۔تہجد پڑھنے کے عادی تھے۔زندگی آمد برائے بندگی کے قائل تھے۔ہر کسی کو دین اسلام کی دعوت دینا انھوں نے اپنا مشن بنالیا تھا۔ ہر سال چالیس دن کے لیے راہ خدا میں گھر سے نکل جاتے۔حکمت عملی سے کام لینے کے عادی تھے۔حج کرنے کی تمنا کئی برسوں سے ان کے دل میں مچل رہی تھی تو اللہ نے وہ بھی پوری کرادی۔حج کی سعادت نصیب ہونے کے بعد جب گل محمد اپنے گھر پر پہنچے تو چوتھے دن ان کی بیوی نے انھیں ایک تشویشناک بات سنائی۔وہ بولی

''سننے میں آیا ہمارے محلے کے آخری موڑ سے آگے تکونی چوک پر مسروقہ بیگم نام کی ایک عورت دو ماہ سے کرائے کے مکان میں قحبہ خانہ چلا رہی ہے۔میں نے جب سے سنا ہے، میں پریشان ہوگئی ہوں''

گل محمد اپنی بیوی کی باتیں سن کر چونک اٹھے۔ان کے چہرے پہ مایوسی کے آثار نمودار ہوئے،وہ زور سے چلائے کہنے لگے

''اری!...... یہ کیا سنا رہی ہو تم...... کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں یہ بالکل سچ ہے۔آپ منصور سے بھی پوچھ سکتے ہیں''

گل محمد نے اپنے خادم منصور کو اپنے پاس بلایا،اس سے پوچھا تو اس نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔گل محمد نے کہا

''اپنے گلی محلے میں غلاظت کے ڈھیر کو صاف کرنے کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے۔خود ہی آگے آنا پڑے گا''

گل محمد کی بیوی نے کہا

''ہمارے محلے کے مرد اور عورتیں اگر چاہیں تو وہ اس عورت کا قحبہ خانہ

بند کروا سکتے ہیں، مگر کوئی بھی اپنی جان جوکھم میں ڈالنا نہیں چاہتا‘‘
گُل محمد نے کہا
’’کسی بھی محلے میں جب ایک جگہ آگ لگتی ہے تو اگر اس پہ فوری طور پر قابو نہ پایا جائے تو وہ آگ پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے‘‘
گُل محمد رات کو سوئے تو نیند نہ آنے کی وجہ سے آدھی رات تک کروٹیں بدلتے رہے، پھر وہ اٹھے اور تہجد پڑھی۔ خدا سے گڑگڑا کے دعا مانگنے لگے
’’یا الٰہی ......اے میرے مولا......اس عورت کو ہدائت دیجیے۔ اس کا کاروبار بند کروائیے۔ ہمارے محلے کو اس سے محفوظ رکھیے‘‘
دوسرے دن صبح جب گُل محمد اٹھے تو انھوں نے اپنے خادم منصور کو آواز دی۔ وہ فوراً ان کے سامنے حاضر ہوا، اسے کہنے لگے
’’آج دن کو تقریباً بارہ بجے تم میرے ساتھ چلو گے، ایک ضروری کام کے سلسلے میں بازار جانا ہے‘‘
’’جی ٹھیک ہے‘‘ منصور نے ہامی بھری۔
دن کے دس بجے کے قریب گُل محمد نے صلوٰۃ الحاجت پڑھی۔ اللہ سے مدد مانگی اور پورے بارہ بجے چپکے سے اپنے خادم منصور کو اپنے ہمراہ لے کر تکونی چوک کی طرف چل پڑے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد جب وہ تکونی چوک میں پہنچے تو ان کی نظر اچانک تین منزلہ عمارت پر پڑی۔ دوسری منزل کے جھروکوں سے چند حسین و جمیل، بجی سنوری لڑکیاں نہ جانے کس کس کو اپنی جانب بلا رہی تھیں۔ ان لڑکیوں کے درمیان میں مخصوص چال ڈھال کی ایک عورت بالکونی میں کرسی پہ بیٹھی راہگیروں کو دیکھ رہی تھی۔ نوجوان لڑکے اور ادھیڑ عمر کے مرد اس رنگین ماحول کو للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ گُل محمد سمجھ گئے کہ یہی مسروقہ بیگم کا کوٹھا ہے۔ اتنے میں مسروقہ بیگم نے انھیں دیکھ لیا تو وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ کے اشارے سے

انھیں اپنی طرف بلانے لگی۔گل محمد کے ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔پھر انھوں نے ہمت جتاتے ہوئے اللہ کا نام لیا اور پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔منصور بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ جونہی وہ دوسری منزل پہ پہنچے تو مسروقہ بیگم قہقہ زار انداز میں کہنے لگی

''آیئے بڑے میاں جی آیئے،ادھر آیئے''

گُل محمد بولے

''ہم نہیں بیٹھیں گے،بس آپ سے یہ معلوم کرنے آئے ہیں کہ مسروقہ بیگم آپ ہی ہیں؟''

''جی ہاں میں ہی مسروقہ بیگم ہوں۔کہئے،آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

وہ کسی حدتک تشویش میں پڑ گئی۔تمام لڑکیاں مختلف پوز میں اسکے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔کمرے میں لوبان کی خوشبو مہک رہی تھی اور دیواروں پہ فلمی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں چسپاں تھیں۔ایک طرف سنگھاردان پہ کاجل بکھر گیا تھا۔ گل محمد نے کہا

''مسروقہ بیگم...... میں تمہیں اپنی بہن سمجھتا ہوں اور تم بھی مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ میں تمہیں جو کچھ کہوں گا،تمہارے فائدے کے لیے کہوں گا۔ پہلے مجھے یہ بتاو کہ میں جو کچھ کہوں گا کیا تم میری بات مانو گی؟''

مسروقہ بیگم حیرت واستعجاب سے لحہ بھر کے لیے دنگ رہ گئی،پھر کہنے لگی

''کہیے مولانا صاحب،کیا فرمانا چاہتے ہیں آپ؟''

''سنو میری بہن......تم برائی کی دلدل میں پھنس چکی ہو۔تن اور من کو خوش رکھنے کا یہ کاروبار اچھا نہیں ہے۔تم یہ تو جانتی ہو کہ لباس کتنا ہی قیمتی اور خوبصورت کیوں نہ ہو، وقت اسے میلا کر دیتا ہے۔ختم کر دیتا ہے۔تمہارا یہ روپ سروپ، یہ حسن، یہ جوانی اور یہ نازوادا کا رنگیں زمانہ بخدا بیت جائے گا اور اگر کچھ رہے گا تو بس اللہ اور اللہ کے رسول کا نام

باقی رہے گا۔ ہر شخص کو ایک دن دنیا سے جانا ہے۔ لہذا توبہ کرو، ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ واپس راہ راست پہ آجاو۔ تمہیں اللہ کا واسطہ''

مسروقہ بیگم بولی

''مولانا صاحب، دنیا کی کوئی بھی عورت اس نجاست کے تالاب میں نہانا نہیں چاہتی ہے۔ میں اگر اس مقام پہ پہنچی ہوں، تو مرد ذات نے پہنچایا ہے۔ لیکن آپ مجھے پہلے مرد دکھائی دے رہے ہیں جو فرشتہ صفت ہیں، ورنہ یہاں تو طرح طرح کے مرد طرح طرح کے ارمانوں کی پوٹلی لے کر آتے ہیں''

مسروقہ بیگم کی باتیں سن کر گل محمد کا دل بھر آیا، گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ انھوں نے جیب سے رومال نکالا اور آنسو پونچھنے لگے۔ انھیں روتا دیکھ مسروقہ بیگم بھی مایوس ہوگئی۔ گل محمد نے قطار میں کھڑی ان حسین وجمیل لڑکیوں کی طرف دیکھا اور پھر مسروقہ بیگم سے پوچھنے لگے

''یہ کہاں کی لڑکیاں ہیں اور کیا کرتی ہیں؟''

''مولانا صاحب، یہ مختلف شہروں سے اس بڑے شہر میں آئی ہیں۔ ان میں کوئی ٹریننگ کر رہی ہے اور کوئی پڑھائی کر رہی ہے۔ میرے یہاں مخصوص وقت میں آتی ہیں اور پھر واپس چلی جاتی ہیں''

گل محمد نے مزید جانکاری چاہی۔ پوچھنے لگے

''یہ تمام لڑکیاں ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں یا الگ الگ طبقوں کی ہیں؟''

مسروقہ بیگم کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکان ابھری اور پھر ہاتھ کے اشارے سے ہر ایک لڑکی کو متعارف کرانے لگی وہ بولی

''مولانا صاحب، یہ لڑکیاں مختلف فرقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ لمبی لڑکی جس نے لال رنگ کی ساڑی پہنی ہے، اس کا نام سُنیتا ہے۔ اسکے ساتھ والی جس نے یہ گوٹے

دار لہنگا پہنا ہے، اس کا نام فوزیہ تبسم ہے۔ اس سے آگے والی جس نے زین کی پینٹ پہنی ہے اس کا نام شاردہ کور ہے اور اسکے ساتھ والی جس نے جامنی رنگ کا سوٹ پہنا ہے، اس کا نام ماریہ ہے'' مسروقہ بیگم نے باقی تین لڑکیوں کے نام بھی بتا دیئے۔

گل محمد نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگے

''میری بہن، میرا دل دکھی ہو رہا ہے اور آنکھیں رونے لگی ہیں۔ خدا کے لیے واپس آو۔ ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ چھوڑ دو یہ مہا پاپی دھندہ۔ ان لڑکیوں کو اپنے اپنے مقام پہ واپس بھیج دو۔ زندگی کو اللہ کی عبادت میں گزار دو۔ یہ زندگی تمہیں اک بار ملی ہے محض اللہ کی بندگی کے لیے، اس بُرے کام کے لیے نہیں۔ اس لیے زندگی کو غنیمت جانو، کیا معلوم کہاں زندگی کی شام ہو جائے''

مسروقہ بیگم نے کہا

''ٹھیک ہے مولانا صاحب، مجھے آپ کی باتوں سے پورا اتفاق ہے، لیکن میرا آپ سے ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ یہ لڑکیاں تو اپنے اپنے ٹھکانوں پہ چلی جائیں گی، لیکن میری روزی روٹی کا کیا ہوگا۔ میں کہاں جاوں گی؟''

گُل محمد نے کہا

''سنو میری بہن، جس اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے، اس نے تمہاری روزی روٹی کا بھی بندوبست کیا ہے۔ بس تم نیک نیتی سے زندگی گزارنے کا عزم کرو۔ دوسری بات یہ کہ میں نے تمہیں اپنی بہن سمجھا ہے لہذا میری مدد کی تمہیں جہاں کہیں بھی ضرورت پڑے میں حاضر ہو جاوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں کپڑے سینے والی مشین خرید کے دوں تا کہ تم ایک باعزت اور خود کفیل زندگی جی سکو''

مسروقہ بیگم کو اللہ نے ہدایت دے دی۔ وہ خوش ہوگئی اور کہنے لگی

''مولانا صاحب، بس آج سے میں نے اپنی زندگی کا رخ بدل دیا۔ میں توبہ کرتی

ہوں کہ آج کے بعد میں کوئی بھی بُرا کام نہیں کروں گی اور یقین جانیے کہ کل سے آپ مجھے یہاں نہیں پائیں گے"

گل محمد کا چہرہ، مسروقہ بیگم کی باتیں سن کر گُل کی طرح کھل اٹھا۔ انھوں نے چار ہزار روپے اپنی جیب سے نکالے اور اپنے خادم منصور کو پکڑاتے ہوئے اسے کہنے لگے

"منصور تم جاؤ اور باہر مارکٹ سے کپڑے سینے والی مشین میری بہن کے لیے خرید لاؤ۔ ہاں سنو، ساتھ میں جا کر گھر سے وہ جائے نماز اور تسبیح بھی لیتے آنا جو میں مدینہ پاک سے لایا ہوں"

منصور گیا اور ایک گھنٹے کے بعد تینوں چیزیں گل محمد کے سامنے پیش کر دیں۔ گل محمد نے تینوں چیزیں مسروقہ بیگم کو دیں اور کہنے لگے

"یہ لو میری بہن، میری طرف سے"

مسروقہ بیگم نے جائے نماز کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور تسبیح کا بوسہ لیا۔ گل محمد اٹھے اور مسروقہ بیگم سے رخصت لے کر اپنے گھر چلے آئے۔ دوسرے دن جب وہ تکونی چوک کی طرف گئے تو انھیں مسروقہ بیگم کے کوٹھے پہ نہ تو لڑکیاں نظر آئیں اور نہ ہی مسروقہ بیگم۔ البتہ انھوں نے اسکے کمرے کے دروازے پہ پیتل کا ایک بڑا سا تالا لگا دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور دل ہی دل میں سوچنے لگے اللہ نے مجھ سے کار خیر کروایا ہے اور یہ بھی کہ ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا۔

....

چار چہرے

ملک کے ایک عام شہری کی قسمت کا جب ستارہ چمکا تو وہ ملک کا سربراہ بن بیٹھا۔ بیوی بچے تو تھے نہیں اس لیے موہ مایہ کے مکڑ جال سے دور اس پہ بس یہ دھن سوار تھی کہ اپنے دور حکومت میں وہ دو ایسے کام کر دکھائے جو اس کی شخصیت میں چار چاند لگائیں اور عوام وخواص اسے اپنا محبوب رہنما سمجھنے لگیں۔ ایک یہ کہ پورا ملک صاف ستھرا رہے۔ اس کے لیے گلی محلے سے لے کر سرکاری وغیر سرکاری اداروں، شہروں، بازاروں اور چوک چوراہوں تک صفائی کے احکامات جاری کیے اور عملی طور پر ہر شخص کو اس صفائی پروگرام میں شامل ہونے پر زور دیا۔ دوسرا یہ کہ کالے دھن پہ چھاپا مارا جائے کیوں کہ کچھ لوگوں نے رشوت کو مال غنیمت سمجھ کے اربوں کی تعداد میں روپیہ اکھٹا کر رکھا ہے۔ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے اس سربراہ کے یہ دونوں منصوبے کسی حد تک بہت اچھے تھے۔ لاکھوں لوگوں کے اجتماع میں جب وہ ملک کو صاف ستھرا رکھنے کی بات کرتا تو اپنی پر جوش تقریر میں یہ ضرور کہتا کہ صفائی سے انسان، انسان ہے۔ غلیظ اور گندہ تو حیوان ہے۔ صفائی کے بہت سے فائدے سمجھاتے ہوئے وہ خوشی محسوس کرتا اور عوام کو یہ یقین دلاتا کہ اگر لوگ باگ صفائی کا خاص خیال رکھیں تو ہمارے ملک سے تمام دکھ بیماریاں دور ہو جائیں گی۔ صفائی پروگرام کی عملی صورت حال کے نتیجے میں سارا ملک صفائی ابھیان میں جٹ گیا۔ یہ سب دیکھ کے ملک کے سربراہ کے دل کا کبوتر خوشی سے چہک اٹھا، اس کے چہرے پہ رنگت اور ہونٹوں پہ مسکان رقص کرنے لگی۔ اپنے ملک کے ماحول کو صاف ستھرا دیکھنے کی چاہت کے ساتھ ساتھ اب ملک کے سربراہ کی دوسری تمنا یہ تھی کہ کالے دھن پہ قابو پایا جائے۔ اس اہم کار خیر کے لیے

اس نے ایک دن اچانک شام ہوتے ہی اپنی مملکت میں بذریعہ الیکٹرانک میڈیا یہ حکم صادر کر دیا کہ آج رات بارہ بجے کے بعد 500 اور 1000 ہزار روپے کے نوٹ رد کر دیئے جائیں گے اور ایک مقررہ مدت تک مسترد نوٹ بینکوں میں جمع کروائے جاسکتے ہیں۔ یہ حکم نامہ سنتے ہی پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ رشوت خور طبقہ سب سے زیادہ تشویش اور بوکھلاہٹ محسوس کرنے لگا۔ ہر عام آدمی اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ 500 اور 1000 روپے کا نوٹ اس کے دل و دماغ پہ ہتھوڑے کا کام کرنے لگا۔ ادھر حاجی عبدل غفار حال ہی میں حج کر کے لوٹے تھے۔ ان کی جیب میں بھی 500 اور 1000 روپے کے کرارے نوٹ تھے۔ انھوں نے وہ تمام نوٹ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اپنی جیب سے باہر نکالے اور انھیں گننے لگے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کل تک یہ پانچ سو اور ہزار روپے کے نوٹ میرے بٹوے کی زینت بنے ہوئے تھے لیکن آج یہی نوٹ ملک کے سربراہ کے ایک حکم سے اپنی اہمیت و افادیت کھو چکے ہیں۔ یا الٰہی یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا کہ ہر شخص قطار میں کھڑا ہو گیا؟ پھر اچانک ان کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ درگور ہونے کے بعد کہیں میرے نیک اعمال بھی ان نوٹوں کی طرح جعلی نہ قرار پائیں، دوسرے دن جب وہ اپنی پاس بک لے کر بینک کی طرف جانے لگے تو اپنے گھر سے دور ایک جگہ کچے مکان سے انھیں بسنتی نام کی ایک بُڑھیا اور اس کی نواسی منجو کے درمیان تکرار سنائی دی۔ منجو نے کہا

''نانی آپ بینک میں نہیں جائیں گی، آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔
میں آپ کی پاس بک لے کر پانچ سو روپے کا نوٹ بینک میں جمع کروالوں گی''

بڑھیا گھر سے باہر نکلتے ہوئے بولی

''کلموہی کہیں کی، چپ رہ میں خود بینک میں جاؤں گی۔ آج کل بینکوں کے باہر لوگ قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں۔ تُو جوان لڑکی کیا قطار میں کھڑی اچھی لگے گی؟''

منجو نے اصرار کیا'' نانی، آپ نہیں جائیں، میں جاؤں گی۔ میں نے کہا نا آپ کی

صحت ٹھیک نہیں ہے''

بڑھیا نے منجو کی بات پہ دھیان نہیں دیا۔اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بیٹا نہیں تھا۔گھر والا بہت پہلے پرلوک سدھار گیا تھا۔اس لیے منجو ہی اپنی نانی کی دیکھ ریکھ کرتی تھی۔ ہاتھ میں پاس بک اور جیب میں پانچ سو روپے کا نوٹ لیے جب بڑھیا بینک کے باہر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ مرد اور عورتیں اکٹھے ایک لمبی قطار میں کھڑے ہیں۔ وہ بھی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ اس سے آگے ایک سو اکیس لوگ کھڑے تھے۔ حاجی عبدل غفار، بڑھیا سے تھوڑی دور آگے قطار میں کھڑے تھے۔لوگ اپنی باری کے انتظار میں ایک دوسرے کو دھکا دے رہے تھے۔ آج آسمان بالکل صاف ستھرا تھا۔اس لیے دھوپ کافی تیز تھی۔قطار کچھوا چال میں چل رہی تھی کہ اچانک کہیں سے ایک موٹا لمبا بانکا مشٹنڈا نوجوان نشے میں مخمور آیا اور دور آگے قطار میں گھسنے لگا۔اسے دیکھ کچھ لوگوں نے احتجاجاً کہا

''ارے اسے روکو، یہ آگے کہاں جا رہا ہے۔اسے پیچھے بھیجو۔ہم یہاں صبح سات بجے سے کھڑے ہیں''

اس بانکے نوجوان نے ان احتجاج کرنے والوں کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر للکارتے ہوئے بولا

''میں پیچھے نہیں جاوں گا، میری مرضی، بولو تم کیا کرو گے'' اس کے اس منفی رویے سے چند نوجوان اس پر ٹوٹ پڑے،۔اب اسے کوئی مکے مار رہا تھا اور کوئی تھپڑ۔ گویا یہ ظاہر کر رہے ہوں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔آثار یوں دکھائی رہے تھے کہ وہ بانکا اور مشٹنڈا نوجوان اتنی ذبردست دھلائی کے بعد چند ہی لمحوں میں زندگی کی آخری ہچکی لے گا کہ اسی دوران کسی امن پسند آدمی نے قریبی پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔ کچھ ہی وقت کے بعد پولیس آ گئی، بانکے نوجوان کے علاوہ کوئی پندرہ آدمیوں کو پولیس اسٹیشن پہنچایا۔ کچھ لوگ خوش ہوئے، لمبی قطار اچانک سمٹ گئی۔دن کے دو بج چکے تھے۔ بوڑھی بسنتی بہت تھکان محسوس

کرر ہی تھی۔ پیاس سے اس کا منہ سوکھ رہا تھا اور شکم کھانا مانگ رہا تھا۔ اب اسے منجو کی باتیں یاد آنے لگیں۔ بیمار وجود لیے ایک لمبی قطار میں کھڑی اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے اسے اپنا آپ ٹوٹتا بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے دل میں دکھ کی اک ہوک سی اٹھی یہ سوچتے ہوئے کہ اس زمانے کے لوگ کتنے بے رحم اور بے مروت ہو گئے ہیں کہ مجھ بوڑھی پہ کوئی بھی ترس نہیں کھا رہا ہے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا اور وہ چکرا کے دھڑام سے نیچے گر پڑی۔ چند آدمی اس کی طرف لپکے، اسے اٹھا کر بینک میں لے گئے۔ ایک آدمی اسے پانی پلانے کے لیے دوڑا۔ وہ جونہی پانی کا گلاس لے کر بڑھیا کے قریب پہنچا۔ تو اتنے میں اس کی آتما، پرماتما کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پاس بک اور پانچ سو روپے کے نوٹ کے ساتھ مٹھیوں کی صورت میں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے۔

....

سات نمبر کا پاپوش

انوپ دت اور سہیل اختر گہرے دوست بھی ہیں اور ہم پیشہ بھی۔ دونوں سماجی فلاح و بہبود محکمے میں تیسرے درجے کے ملازم ہیں۔ گھر سے یہ دونوں ہر روز ایک لوکل بس میں سوار ہوکر تقریباً چالیس کیلو میٹر کی دوری پہ ڈیوٹی دینے جاتے ہیں۔ بس میں مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان اور بچے ہر طرح کے لوگ سوار ہوتے ہیں۔ انوپ دت میں ایک عجیب عادت یہ ہے کہ وہ صنف نازک کے ساتھ سیٹ پہ نہیں بیٹھتے۔ انھیں چاہے پانچ گھنٹے کھڑے کھڑے کیوں نہ رہنا پڑے۔ لیکن کسی عورت کے ساتھ سیٹ پہ بیٹھنا وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ بس میں کسی عورت کے ساتھ والی سیٹ خالی پڑی رہے، انوپ دت اس پہ ہرگز نہیں بیٹھیں گے۔ یہاں تک کہ اگر وہ بیٹھے ہوں اور کوئی عورت آکر ان کے ساتھ خالی سیٹ پہ بیٹھ جائے تو وہ فوراً اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑے رہیں گے۔ ایک روز ان کے گہرے دوست سہیل اختر نے ان سے پوچھا

''یار انوپ...... میں تجھے کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ تو کسی عورت کے ساتھ سیٹ پہ نہیں بیٹھتا ہے اور پھر حیرت کا مقام یہ کہ اگر تو سیٹ پہ بیٹھا ہو اور کوئی عورت آکے تیرے ساتھ خالی سیٹ پہ بیٹھ جائے تو تو فوراً اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بس میں کھڑے کھڑے دھکے کھاتا رہتا ہے۔ مجھے بتا تجھے کیا پرابلم ہے، ایسا کیوں کرتا ہے'' انوپ دت نے جواب دیا

''یار...... سہیل، میں عورت ذات سے بہت ڈرتا ہوں۔ مجھے رات کو دو کیلومیٹر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اکیلے چلنے سے ڈر نہیں لگتا، لیکن عورت سے ڈر لگتا ہے''

سہیل اختر نے حیرت سے پوچھا ''اس کی کوئی خاص وجہ''

انوپ دت نے کہا

''یار ...... میرا عورت ذات سے ڈرنے یا مرعوب ہونے کی وجہ کا تعلق میری آنکھوں کے سامنے پیش آمدہ ایک واقعے سے ہے۔ وہ یہ کہ ایک بار میں کسی ضروری کام کے سلسلے میں بس میں سوار شہر جا رہا تھا، بس شہر میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ اچانک ایک عورت اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دانت کچکچاتی ہوئی پاس میں بیٹھے دیدہ زیب پینٹ، کوٹ اور ٹائی پہنے ادھیڑ عمر کے ایک مرد پر جھپٹ پڑی۔ عورت نے ایک ہاتھ سے مرد کی ٹائی کو گرفت میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنے دائیں پاؤں کا سات نمبر پاپوش ہاتھ میں لیا اور تابڑ توڑ اس جدید تہذیب کے دلدادہ مرد کے سر پر مارنا شروع کر دیا۔ ڈرائیور نے بیک وقت ایک جھٹکے سے بس روک لی۔ تمام سواریاں اپنی اپنی نشستوں پہ کھڑی ہو گئیں۔ عورت کی پاکیزہ نسوانیت اپنی پوری غیرت کے ساتھ موجزن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عورت غصے سے اس مرد سے پوچھنے لگی

''کیا تیری ماں، بہن، بیٹی نہیں ہے؟''

وہ مرد ڈرو خوف اور بوکھلاہٹ کے باعث تھتھلاتے ہوئے کہنے لگا

''میں ...... ایسا ...... آدمی ...... نہیں ہوں''

پھر کچھ سنجیدہ قسم کے لوگ آگے بڑھے اور انھوں نے اس عورت کی گرفت سے اس مرد کو آزاد کرایا پھر اس باغیرت عورت سے ایک آدمی پوچھنے لگا

''یہ ماجرا کیا ہے تم اسے کیوں پیٹ رہی ہو''

عورت نے ہانپتے ہوئے جواب دیا

''اس مرد کو اپنی ماں، بہن، بیٹی بھول گئی تھی، اس لیے اس کے ہاتھ بے قابو ہو رہے تھے''

سواریوں میں کچھ لوگوں نے زمین کی طرف نظریں جھکا دیں اور کچھ نے مارے شرم کے چہرے پھیر لیے۔ کچھ نے اپنی ہنسی پہ بمشکل قابو پایا اور کچھ کے ہاتھ اس مرد پہ اٹھنے کے لیے ترسنے لگے۔ بالآخر اس مرد نے اس عورت سے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ لیکن میرے دوست اس واقعے سے میری نفسیاتی دنیا میں عورت ذات کا ڈر اس قدر رچ بس گیا کہ میں لاکھ کوششوں کے باوجود اس ڈر سے نجات نہیں پا رہا ہوں''

سہیل اختر نے جب انوپ دت کی زبانی پورا واقعہ سنا تو اس نے کہا

''اچھا یہ بات ہے۔ میرے دوست، دراصل جب کسی مرد کا دل سیاہ اور آنکھیں میلی ہو جاتی ہیں تو پھر اس کے ذہن و دل سے کسی کی ماں، بہن، بیٹی کو اپنی ماں بہن بیٹی سمجھنے کا جذبہ رخصت ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ایسی صورت میں ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو اپنی عزت و عصمت کے تحفظ کے لیے ان مردوں کے سر پہ وہی سات نمبر کا پاپوش مارنا پڑتا ہے جن کے دل سیاہ اور آنکھیں میلی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے میرے دوست تمہیں میری یہ نصیحت ہے کہ تم جب بھی کسی گاڑی میں سفر کرو تو ہر کسی کی ماں بہن بیٹی کو اپنی ماں بہن بیٹی سمجھو۔ اب بتاؤ کیا تم اس پاک جذبے کے ساتھ گاڑی میں صنف نازک کے ساتھ سفر کرو گے؟''

انوپ دت کے ماتھے پہ ہلکے ہلکے پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ نفی میں سر ہلا دیا۔

....

قبر میں زندہ آدمی

یار خان، قومی شاہراہ پر ٹنل تعمیر کرنے والی ایک آسٹریلین کمپنی کے ساتھ اے کلاس ٹھیکیدار تھے۔ ان کا قد درمیانہ، رنگ سانوالہ، آنکھیں نیلی، سر کے بال ادھ کالے، داڑھی کے بجائے نوکدار لمبی مونچھیں رکھنے کے شوقین تھے۔ روپے پیسے کو وہ اپنے ہاتھ کی میل سمجھتے تھے۔ شہر میں ان کا بہت بڑا امکان دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی منسٹر کی کوٹھی ہے۔ اس قدر رنگین مزاج تھے کہ دنیا کو دارالعمل کے بجائے دارالتفریح سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ام الخبائث کو صحت کے لیے مفید خیال کرتے تھے۔ تجربے اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہے کہ آدمی کے دل میں اگر ایمان کی رمق نہ ہو تو ایک بڑا عہدہ اور روپیہ اس کو عیاش اور اللہ کا باغی بنا دیتے ہیں۔ یار خان کو روپے نے بہت حد تک عیاش اور اللہ کا باغی بنا دیا تھا۔ ان کی پندرہ لاکھ کی چمچماتی گاڑی دیکھنے والوں کا دل موہ لیتی تھی۔ ان کی بیوی حسینہ بیگم میٹرک پاس، خوب صورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی۔ کہتے ہیں کہ مرد کی ترقی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ حسینہ بیگم نے شادی کے بعد اپنے شوہر یار خان کا قدم قدم پہ ساتھ نبھایا تھا۔ یار خان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سب کچھ کسی حد تک ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ اچانک یار خان پر ایک اور بیوی رکھنے کا جنون سوار ہوا۔ رجنی نام کی ایک گریجویٹ لڑکی ان پہ فریفتہ ہو گئی۔ وہ بھی اس کے خوابوں اور خیالوں میں اپنی صبح کو شام کرنے لگے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ایسا ہی معاملہ یار خان کے ساتھ بھی ہوا۔ انھوں نے کافی کوشش کی تھی کہ حسینہ بیگم کو ان کے معاشقے کا پتا نہ چلے لیکن ایک روز وہ موبائل فون پہ رجنی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ حسینہ بیگم نے ان کی باتیں سن لیں۔ ایک

عورت اپنے شریک حیات کی تقریباً تمام خرمستیاں کسی حد تک برداشت کر لیتی ہے لیکن وہ ہرگز یہ برداشت نہیں کرتی کہ اس کی سوتن ہو۔ حسینہ بیگم نے سہمے ہوئے انداز میں یار خان سے پوچھا

''میں نے اپنی طرف سے ایک وفادار بیوی کی طرح آپ کا ساتھ نبھایا ہے۔ آپ کے ہر سکھ دکھ میں شریک رہی ہوں، لیکن اس کے باوجود مجھے آپ یہ بتائیے کہ یہ رجنی کون ہے''؟

یار خان اپنی بیوی کی پر شکوہ باتیں سن کر یوں محسوس کرنے لگے کہ جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں پھر انھوں نے بڑے نرم لہجے میں کہا

''حسینہ۔ رجنی نام کی لڑکی میری زندگی میں آنا چاہتی ہے۔ تمہاری صحت ناساز رہتی ہے، اس لیے میں بھی چاہتا ہوں کہ تمہیں آرام ملے۔ دونوں گھر کے کاموں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتی رہو گی وہ گریجویشن کر چکی ہے۔ ہمارے بچوں کو گھر میں پڑھائے گی''

یار خان کی باتیں سن کر حسینہ بیگم کو یوں لگا کہ جیسے اس کا سارا وجود مفلوج ہو گیا ہو۔ اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا

''مجھے رجنی نہیں چاہیئے ۔ میں گھر کے سب کام خود کر لوں گی اور پھر نوکر چاکر بھی تو ہیں۔ آپ چار بچوں کے باپ ہیں۔ عمر کے لحاظ سے ساٹھ کے پیٹے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس عمر میں رجنی کو بیوی بنانے کا شوق دل میں پالے ہوئے ہیں۔ کچھ تو شرم کیجئے، لوگ کیا کہیں گے ذرا سوچیئے تو سہی''

یار خان نے جواب دیا

''حسینہ...... میں رجنی کا دل توڑنا نہیں چاہتا، اور یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا''

حسینہ بیگم نے کہا'' شیطان آپ کو بہکا رہا ہے۔ لہذا سنبھل جائیے''

یار خان نے فوراً ذہنی کروٹ بدلی کہنے لگے

''حسینہ......تم اس بات کو کیوں بُرا خیال کرتی ہو، اسلام میں تو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے''

حسینہ بیگم سے چُپ نہیں رہا گیا، وہ بول اٹھی

''آپ نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، عشر و ذکوٰۃ کا آپ کو پتا نہیں۔ اللہ نے آپ کو خود کفیل بنایا ہے۔ روپے پیسے کی بہتات ہے، لیکن آج تک آپ کو حج و عمرہ کا خیال نہیں آیا۔ بس صرف آپ کو اتنا یاد ہے کہ اسلام میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے''

حسینہ بیگم کی حقیقت آمیز باتیں سن کر یار خان کے تیور بدل گئے، مردانگی نے جوش مارا، تلخ لہجے میں کہنے لگے

''حسینہ......تم اس بات کو نہ بھول جاو کہ تم عورت ہو اور میں مرد ہوں۔ اپنی حد میں رہو۔ اب تم مجھے اس عمر میں اسلام سکھانے لگی۔ میں دیکھ لوں گا مجھے کیا کرنا ہے'' یہ کہتے ہوئے وہ دندناتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔

حسینہ بیگم کے دل و دماغ میں دکھ کے سیاہ بادل منڈلانے لگے، آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا اور دل میں غم کی اک ہوک سی اٹھی۔ پھر آنکھیں چھم چھم آنسو بہانے لگیں۔ اس نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں، اشکبار آنکھیں، ملتجی دل و دماغ کے ساتھ اپنے دست حنائی دراز کیے اللہ سے فریاد کرنے لگی

''یا اللہ......میں دکھیاری، آپ کی مدد اور سایہء رحمت کی طلبگار ہوں۔ میرا گھر والا بہک گیا ہے۔ اسے شیطان نے اچک لیا ہے۔ میں اسے ہدایت نہیں دے سکتی، ہدایت آپ نے اپنے پاس رکھی ہے۔ یا اللہ، میرے سرتاج کو ہدایت دیجیے''

حسینہ بیگم کی سات سالہ بیٹی شازیہ، دوسرے کمرے سے اس کے پاس آئی، اس نے جب ماں کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تو اس نے مایوسی کے انداز میں پوچھا

''مماں آپ کیوں رو رہے ہو''؟ حسینہ نے فوراً اپنے آنسو پونچھے اور بیٹی کو ٹالتے ہوئے کہنے لگی

''بس یوں ہی مجھے آج اپنی ممی اور پاپا یاد آ رہے تھے''

بیٹی نے کہا''تو چلو نا مماں، نانی اور نانو کے گھر''

حسینہ بیگم کے شب روز تشویش میں گزر رہے تھے۔ یار خان دن میں تین چار بار رجنی سے موبائل فون پہ باتیں کرتے۔ گھر میں کسی حد تک اکھڑا اکھڑا سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ چند دنوں کے بعد یار خان کے بھتیجے کی شادی ہونے والی تھی۔ یارحان نے بڑے شوق سے اپنے اور بیوی بچوں کے لیے بہترین سوٹ بوٹ خریدے۔ وہ یوں لگ رہے تھے کہ جیسے ان کے اپنے بیٹے کی شادی ہو۔

برات کے دن یار خان کے ہم پیالہ وہم نوالہ ان کے شانہ بشانہ تھے۔ دلہے راجہ کی گاڑی طرح طرح کے پھولوں سے آراستہ کی گئی۔ تھی۔ لڑکی والوں نے برات والوں کے قیام وطعام کا انتظام شہر کے سب سے عالیشان جنج گھر میں کیا تھا۔ برات میں ڈیڑھ سو آدمی تھے جن میں یار خان کے بیوی بچے بھی شامل تھے۔ ڈھول باجے کے ساتھ برات گھر سے رخصت ہوئی۔ یار خان خوب ناچے اور اپنے یاروں کو بھی ناچنے پر مجبور کرنے لگے۔ جنج گھر پہنچنے کے فوراً بعد نکاح خوانی کی رسم انجام دی گئی، اس کے فوراً بعد براتی کھانے پہ ٹوٹ پڑے۔ لیکن یار خان کے پیٹ میں فتور پڑ گیا اس لیے انھیں مجبوراً حاجت بشری کے لیے بیت الخلا جانا پڑا۔ رفع حاجت سے فارغ ہونے کے بعد جب ان کی اندر سے دروازے کے ہینڈل پہ نظر پڑی تو وہ بغیر ہینڈل کے تھا، اندر جاتے وقت تو انھوں نے دروازے کو معمولی سا دھکا دیا تھا تو دروازہ بند ہو گیا تھا۔ مگر اب بغیر ہینڈل کے دروازہ کھلنا ناممکن تھا۔ یار خان کے حواس گم ہونے لگے۔ گھبراہٹ سے کپکپی شروع ہوئی۔ وہ بار بار دروازے پہ ہاتھ پھیرنے لگے۔

کبھی دروازے کے اوپری شگاف میں انگلیاں پھنسانے کی سعئی کرتے اور کبھی دروازے کے نچلے شگاف میں شہادت کی انگلی ڈالنے کا جتن کرتے۔ تمام حربے استعمال کرنے کے بعد جب دروازہ نہیں کھلا تو یار خان نے فوراً کوٹ کی جیب سے اپنا قیمتی رنگین موبائل سیٹ نکالا اور اپنی اہلیہ حسینہ بیگم کا نمبر ڈائل کیا۔ لیکن موبائل فون سے انھیں یہ حکمنامہ سنائی دیا کہ یہ نمبر پہنچ سے باہر ہے۔ کرپیا تھوڑی دیر بعد ڈائل کریں۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی کا نمبر ڈائل کیا تو وہاں سے بھی انھیں یہی جواب سننے کو ملا۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے اپنے چار پانچ دوستوں کے نمبر ڈائل کئے تو کسی بھی دوست سے ان کی بات نہیں ہو پائی۔ ان کا دل تیزی سے دھڑ کنے لگا۔ بیت الخلا سے دور ایک طرف براتی کھانا کھا رہے تھے اور دوسری طرف باہر کچھ نوجوان لڑکے، لڑکیاں اور ادھیڑ عمر کے لوگ ڈیک پہ بج رہے پنجابی گانے کی دھن پہ ناچ رہے تھے۔ یار خان نے چیخ چیخ کے ہیلو ہائے میں آوازیں دیں لیکن ان کی آواز بیت الخلا تک ہی محدود ہو کے رہ گئی۔ اچانک بیت الخلا سے بجلی بھی رخصت ہوگئی۔ اب یار خان کو اپنے آس پاس موت کے سائے منڈلاتے معلوم ہونے لگے۔ اپنی زندگی بھر کے گناہ یکے بعد دیگرے یاد آنے لگے۔ اب انھیں اللہ اور اللہ کے رسول یاد آئے۔ وہ اپنے آپ کو جیتے جی قبر میں سمجھنے لگے۔ تب ان کے دل کے کسی گوشے سے لرزتی ہوئی آواز زباں تک پہنچی اور وہ روتے گڑگڑاتے ہوئے اپنے حقیقی خالق و مالک کو پکار اٹھے

''یا اللہ میں گناہگار سراپا ہوں۔ مجھے اک بار معاف کر دیجئے۔ مجھے اس وحشت وتاریک جگہ سے باہر نکال دیجیے۔ میں بقیہ ساری زندگی آپ کے احکامات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں کے مطابق گزاروں گا۔ مگر ایک بار مجھ پہ اپنی رحمت وبخشش کی نگاہ ڈالیے...... یا اللہ میری مدد فرمایئے۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے''

یار خان پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ بیت الخلا کی تاریکی، گرمی، تعفن اور گھٹن

کے سبب انھیں یوں محسوس ہونے لگا کہ چند ہی لمحوں کے بعد وہ زندگی کی آخری ہچکی لیں گے۔ اچانک ان کی کھوئی ہوئی طاقت و ہمت ان کے وجود میں لوٹ آئی اور انھوں نے زور زور سے دروازے پہ دستک دینا شروع کی۔ اتفاقاً حسینہ بیگم باہر سے گزر رہی تھی کہ اسے مردانہ بیت الخلا کے ایک دروازے پہ دستک سنائی دی۔ وہ پہلے تو سہم گئی پھر اس دروازے کے قریب گئی اور کان لگا کر زور سے پوچھنے لگی

''کون ہو، کیا بات ہے''؟

یار خان نے کہا

''میں یار خان ہوں، دو گھنٹے سے یہاں اندر بند ہو گیا ہوں۔ اس دروازے کا اندر سے ہینڈل نہیں ہے، باہر سے دروازہ کھولو تا کہ میں باہر آسکوں''

حسینہ بیگم کے چہرے پہ شادی کی خوشی کی رونق فوراً کافور ہو گئی۔ اس نے حیرت سے یار خان سے پوچھا

''آپ......اندر......ہیں''؟

یار خان نے ڈوبتی ابھرتی آواز میں کہا

''ہاں......میں......اندر ہوں''

حسینہ بیگم نے کہا ''اللہ پہ بھروسہ رکھیئے، ہمت و حوصلے سے کام لیجیے، میں باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی ہوں''

حسینہ بیگم نے باہر سے ہینڈل گھمانے کی بھرپور کوشش کی لیکن دروازے میں معمولی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔ پھر وہ دوڑ کر گئی اور اپنے دیور اور دیورانی کو اس واقعے سے آگاہ کیا۔ یہ افسوس ناک خبر چند لمحوں میں جنگل کی آگ کی طرح تمام براتیوں تک پہنچ گئی۔ جس نے جہاں سنا وہ وہیں سے جنج گھر کے بیت الخلا کی طرف دوڑا۔ دیکھتے دیکھتے ایک ہجوم سا اکھٹا ہو گیا۔ درجنوں تجربہ کار افراد نے دروازے پہ ہاتھ مارا لیکن دروازہ تھا کہ ٹس

سے مس نہیں ہوا۔ بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دروازے کو توڑ دیا جائے۔ایک آدمی کے ہاتھ میں مارتوڑ تھمایا گیا۔ مارتوڑ کی تین چار ضربیں جب درووازے پہ پڑیں تو دروازہ ٹوٹ گیا۔ اندر سے یارخان روتے ہوئے باہرآئے اور سب سے پہلے حسینہ بیگم کو گلے لگایا پھر چاروں بچوں کو باری باری گلے لگانے کے بعد اپنے بڑے بھائی سے گلے ملے اور رقت آمیز لہجے میں لوگوں کے ہجوم کی طرف مخاطب ہوئے اور کہنے لگے

''میں جیتے جی قبر میں پہنچ گیا تھا۔اوپروالے کی مہر کہ زندہ ہوں، دنیاوالو! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کب اوپر والے کا بلاوا آئے۔اس لیے سنبھل جاو۔اچھے برے کا خیال رکھو''

یارخان کی بھوک پیاس ختم ہوچکی تھی۔ان کے شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں قبر کی تاریکی اور تنہائی رچ بس چکی تھی۔دوسرے دن جب وہ بیوی بچوں کے ساتھ اپنے گھر پہنچے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنی مونچھیں کٹوادیں۔مٹھی بھر لمبی داڑھی رکھنے کا مصمم ارادہ کیا۔انھوں نے مفتی محمد معظم کو اپنے گھر پر دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔مفتی صاحب جب مقررہ وقت پر یارخان کے گھر پہنچے تو یارخان نے مفتی صاحب سے مشورہ چاہا، انھوں نے مفتی صاحب سے پوچھا

''مفتی صاحب، میں ایک ایسا دینی مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں جس میں دینی ودنیوی علوم کی تدریس ہواوراس میں صرف یتیم بچے تعلیم حاصل کریں۔آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

مفتی صاحب خوش ہوئے۔انھوں نے کہا'' جناب، نیکی اور پوچھ پوچھ، آپ کا ارادہ نیک ہے۔اس لیے اسے عملی جامہ پہنایئے''

یارخان نے کہا

''مفتی صاحب، میرا دوسرا اردہ یہ ہے کہ میں اس سال حج کروں۔حج کا فارم کہاں سے ملتا ہے''؟

مفتی صاحب نے کہا

''آپ کا یہ ارادہ بھی نیک ہے۔حج فارم آپ کو حج ہاؤس سے ملے گا''

یارخان اب وہ پہلے جیسے یارخان نہیں رہے تھے۔ ہر نیک کام میں پہل کرنا اب انھوں نے اپنا شعار بنالیا تھا۔ان کی زندگی دینی رنگ میں رنگ چکی تھی ۔تمام نیکیاں انھوں نے اپنے دامن حیات میں سمیٹ لی تھیں۔ایک روز وہ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز عصر پڑھ رہے تھے کہ ان کے موبائل فون پہ بار بار رینگ ٹیون بجنے لگی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو معلوم ہوا کہ رجنی کی چھ کالیں آ چکی تھیں۔یارخان کے چہرے پہ غم وغصے کے آثار ابھرے،انھوں نے موبائل سیٹ ایک طرف رکھ دیا اور ذکراللہ میں لگ گئے۔عشا نماز باجماعت پڑھ کر جب وہ گھر لوٹنے لگے تو رجنی انھیں پھر فون کرنے لگی۔ انھوں نے فون نہیں اٹھایا۔وہ دیر تک فون کرتی رہی۔آخر کار اس نے یہ ایس ایم ایس کیا

''عورت وفادار ہوتی ہے اور مرد بے وفا ہوتا ہے''

جب رجنی، بیچ بیچ میں یارخان کو فون کرتی رہی تو یارخان نے تنگ آکر اپنے موبائل فون کی سم بدل دی۔ایک دن یارخان نے مسکراتے ہوئے اپنی رفیقہ حیات حسینہ بیگم کو کہا

''میں صبح نیند سے بیدار ہونے کے بعد جب تمہارے رخ زیبا کو دیکھتا ہوں تو لمحہ بھر کے لیے میرے دل ودماغ سے قبر کی تاریکی،تنہائی اور وحشت کا خیال زائل ہو جاتا ہے''

حسینہ بیگم کا چہرہ یارخان کی باتیں سن کر پُر رونق ہو گیا وہ بولی''میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ آپ ہر وقت میری نظروں میں رہیں''

حسینہ بیگم دل ہی دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

☆☆☆☆☆